رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۴۰

شعبان ـ رمضان ۱۳۷۴ھ

جلد ۴۴ عدد ۲ - ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپئے

قیمت فی پرچہ دس آنے

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

جلد اول (طبع دوم)

سورۃ فاتحہ تا الانعام

قرآن پاک کا عام فہم سلیس اردو ترجمہ و تفسیر مع عربی متن قرآن حکیم کے فطری طرز استدلال اور اسکی جامعیت پر حکیمانہ تبصرہ غیر اسلامی زندگی پر سائینٹفک تنقید ۔ مدلل تشریح و تعبیر

دل نشین انداز بیان

اہم مسائل ۔ فلسفہ ۔ قوانین حیات کی مجتہدانہ وضاحت غیر اسلامی نظام ہائے حیات کے مد مقابل نظام اسلامی کا

مکمل اور جامع نقشہ

سابق کتب مقدسہ کے حذف و اضافہ کی نشاندھی، اسلام اور جاہلیت کی تاریخی کشمکش پر بے لاگ تبصرہ، ان خصوصیات کے ساتھ بصیرت افروز مقدمہ ۔ سورتوں کے عنوانات ان کا زمانہ نزول اور پس منظر ربط آیات ــــــ

جغرافیہ قرآن کے متعدد تاریخی نقشہ جات ۔ فہرست موضوعات بہترین کتابت ۔ عمدہ کاغذ و طباعت ۔ خوشنما مضبوط جلد

سائز $\frac{22 \times 29}{8}$ ضخامت ہونے سات سو صفحات

هدیہ !

قسم اول مع بکس ۱۲ ۲۰ علاوہ
قسم دوم ،، ۴ ۱۸ ختم ہے
قسم سوم بغیر بکس ختم ہے

خصوصی جلدیں !

قسم دوم ۱۲/۲، ۲۲/۰۲، مطلا کنارہ ۲۹/- مطلا جلد و کنارہ ۳۱/-، ۱۲/۲۴

قسم اول ۱۲/۲۲، مطلا کنارہ ۳۱/- مطلا جلد و کنارہ ۳۳/-

جلد دوم (طبع اول)

سورۃ الاعراف تا بنی اسرائیل

تفہیم القرآن جلد دوم کیلئے ملک کے گوشہ گوشہ سے دریافت کیا جا رہا ہے اسکی طباعت میں تاخیر کا باعث کاغذ کی کمیابی کے سوا کچھ نہیں ۔ امپورٹ کردہ کاغذ پر طباعت ہوچکی ہے توقع ہے کہ آخر فروری تک فرمائشوں کی تعمیل شروع ہوسکے گی جس ترتیب سے ہمارے ہاں فرمائشیں درج ہو رہی ہیں ۔ اسی ترتیب سے تعمیل کی جائیگی اگر فرمائش درج نہیں کرائی تو آج ہی اپنی فرمائش تحریر فرماویں ۔

ناظم

مکتبہ تعمیر انسانیت

موچیدروازہ ۔ گجر گلی ۔۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

[ایک طویل وقفہ کے بعد یہ موقع نصیب ہوا کہ ترجمان القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ادارت میں مرتب ہو۔ چنانچہ مولانا نے اس مرتبہ دو ماہ کی یکجائی اشاعت کی ترتیب کا بیشتر کام خود ہی سرانجام دیا لیکن اشارات لکھنے کی تیاری کے دوران ہی میں آپ بیمار پڑ گئے۔ مولانا کی بحالی صحت میں کچھ نہ کچھ وقت لگے گا، لہٰذا پرچہ کو لیٹ ہوتے دیکھ کر چار و ناچار پھر مجھی کو اشارات کے صفحات بھرنے پڑے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو جلد صحت و قوت عطا فرمائے۔ ن۔ص]

---

(۱)

اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جو تاریخ پاکستان کے اس عظیم واقعہ پر ہمارے گہرے جذبات حمد و سپاس کا مستحق ہو کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہٗ پہلے ضمانت پر عارضی حیثیت سے اور اب ایک سرکاری اعلان کے تحت مستقلاً رہا کر دیئے گئے ہیں[1]۔ راہِ حق میں ابتلاء کا وہ ہمت آزما سفر جو شاہی قلعہ لاہور سے شروع ہوا تھا، پھانسی کی کوٹھری اور چودہ سال قید بامشقت کے پُرپیچ مراحل کو پچیس ماہ کے عرصے میں عبور کر کے

[1] لیکن یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ مولانا مودودی، مولانا عبدالستار خاں نیازی اور چار مزید اسیرانِ مارشل لا کی بقیہ مدتِ قید کو ختم کرنے کا اعلان اپنی حدودِ ظرف میں بقیہ چند اسیران کو نہ دے سکا۔ چاہیے کہ حکومت اب ان سب کو رہا کر دے۔ بلکہ مولانا اصلاحی کے مشورے کے مطابق مزید فیاضی سے کام لے کر راولپنڈی سازش کے قیدیوں اور دوسرے سیاسی اسیروں کو رہا کر کے اپنے حق میں فضا کو خراب ہونے سے بچائے۔

بخیر و خوبی ختم ہو چکا ہے۔

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے!

جرم دیکھیے تو "قادیانی مسئلہ" جیسا سنجیدہ علمی پمفلٹ لکھنے کا جرم جو عام قانونِ ملکی کے تقاضوں سے کوئی منافات نہیں رکھتا، اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ کی سرسری اور عاجلانہ سماعت، پھر دنیا کی انتہائی سزا دینے کا فیصلہ، اور بعد میں اس کا عمر قید میں بدلا جانا، پھر ملکی عدلیہ کے سامنے اپیل کے حق کا سلب کیا جانا اور انڈمنٹی آرڈی نینس کے ذریعے اس سزا پر گورنر جنرل کا قانونی مہر ثبت کر دینا، پھر دستوریہ کا اس آرڈی نینس کی توثیق کر کے اسے مستقل ایکٹ بنا دینا، پھر کم سے کم تین سال کی سزا کی حد تک فیڈرل کورٹ کے کسی نامعلوم جج کی رائے کا حصول اور اسے دیر تک مخفی رکھا جانا، اور پھر اس خاص قیدی کے لیے ایامِ معافی کے حق کا ایک بڑا حصہ روکا جانا —— یہ پورا سلسلۂ احوال گواہ ہے کہ مولانا مودودی پر کس عزم کے ساتھ عنایتِ خاص فرمائی جا رہی تھی۔ دوسری طرف دیکھیے کہ مولانا مودودی کی رہائی کے لیے عوام کی مسلسل اور ملک گیر چیخ پکار کا جواب کس شانِ تغافل سے دیا جاتا رہا، ممتاز شہریوں کے وفود کے سامنے مرکزی وزرا کس اسلوب سے کوئی دوٹوک جواب دینے سے گریز فرماتے رہے، پھر پنجاب اسمبلی میں اکثریت کے رجحان (اور مطالبۂ رہائی پر بہت سے ممتاز ارکان کے دستخط کرنے) کے باوجود کس پُراسرار تدبیر سے ریزولیوشن پاس ہونے کو روکا گیا، پھر ملک نون نے کس تحدی سے فرمایا تھا کہ میری حکومت مولانا مودودی کی رہائی کی سفارش کرنے پر تیار نہیں۔ پھر یاد کیجیے سرکار کے اس مزاج شناس اخبار نویس کو جس نے اس سلسلے میں ایک محضر نامہ پر دستخط کر کے عوام کا ساتھ دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ اندریں حالات کون اس بات کا متوقع ہو سکتا تھا کہ ۸ اپریل کو یکایک مولانا جیل سے باہر ہوں گے۔

لیکن جن لوگوں کو یہ یقین تھا کہ اس سلطنتِ کائنات کا ایک فرماں روا اور انسانی تاریخ کے واقعات و حوادث کا منصوبہ ساز موجود ہے، جن کے دلوں میں یہ ایمان موجود تھا کہ وہ فرماں روا اور منصوبہ ساز ہستی بااختیار بھی ہے اور اپنے سرکش ترین بندوں پر اس کا حکم اسی طرح بے روک ٹوک چلتا ہے جس طرح زمین

پر رینگنے والی چیونٹیوں پر چلتا ہے اور جن کے دلوں میں یہ اعتماد ہر قسم کے حالات میں کارفرما رہا ہے کہ وہ اپنے نام لیواؤں اور اپنے دین کے خادموں کا نگہبان ہے اور ان کے خلاف چلی جانے والی چالوں کا توڑ کرنے کے لیے اپنی بے پایاں حکمت وطاقت کے ساتھ خود منزل بہ منزل ان کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ ان کے سینوں میں شمعِ امید بادِ مخالف کے تند سے تند جھونکوں کے سامنے بھی کبھی گل نہیں ہوتی۔ وہ ہر آن منتظر رہتے ہیں کہ جب امرِ الٰہی کی کلید رکاوٹوں کے تالے کھولنے کے لیے حرکت میں آجائے گی تو اس کلید کی گردش میں کوئی مزاحم نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ مولانا مودودی کی اچانک رہائی نے ایسے لوگوں کو آج اپنے خدائے واحد پر ایک نئے ایمان واعتماد سے مالا مال کر دیا ہے۔ وزادتھم ایمانا۔

کل اس ملک اور اس ملک سے باہر کے جن ہزاروں لاکھوں افراد کے دل مولانا مودودی کے لیے سزائے موت کا اعلان سن کر تڑپ اُٹھے تھے، پھر وہ دل جو مولانا مودودی کی قید کی ایک ایک گھڑی پر بے چینی اور اضطراب کے ساتھ دھڑکتے رہے ہیں، وہ کہ جنہوں نے ظلم کے خلاف تمام ممکن جمہوری تدابیر سے صدائے احتجاج بلند کرنے کا حق ادا کیا ہے، آج وہ ایک نئی خداداد مسرت سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔ جن آنکھوں میں کل آنسو تیر گئے تھے آج ان کی پتلیوں سے ایک بے پایاں خوشی اُمڈتی دکھائی دیتی ہے۔ کل جن کے لیے عُسر تھا آج ان کے لیے یُسر ہے۔ اور قانونِ قدرت یہی ہے کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ سرگذشت تاریخ کا معمول یہی ہے کہ آرام وراحت کا پھل ہمیشہ مشقت کے پودوں پر لگتا ہے۔ کسی مقصد کے لیے جو جس درجے کی تکالیف سے گزرتا ہے اس کو اسی درجے کی طمانیت جواب میں دی جاتی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

آخر مولانا مودودی میں وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اس کی قید اور اس کی رہائی سے عام اُمت لوگ دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ کوئی فرشتہ یا کوئی فوق البشر ہستی نہیں، ایک انسان ہے اور اسی طرح کا عام انسان ہے جیسے ہم سب ہیں۔ وہ کسی مقام خاص کا مدعی نہیں، اپنے آپ کو محض امت مسلمہ کے ایک عام فرد کی حیثیت میں پیش کرتا ہے۔ وہ پیری کی مسند بچھا کر نہیں بیٹھتا بلکہ عام آدمیوں کی طرح رہتا سہتا ہے

اور عام آدمیوں سے ملتا جلتا ہے۔ وہ اپنے لیے خصوصی امتیازات اور القاب و آداب نہیں چاہتا بلکہ کسی تکلف و تصنع کے بغیر ہر قسم کے لوگ اس سے معاملات رکھتے ہیں۔ وہ کرامات اور شعبدے دکھا کر اور خواب اور کشف بیان کر کر کے کسی کو مسحور نہیں کرتا بلکہ سیدھے سیدھے استدلال سے بات کہتا اور بات کا جواب دیتا ہے۔ اس کے پاس ملک کا کوئی انتظامی و وزارتی منصب نہیں ہے کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں پر دھونس جماتا ہو۔ اس کے قبضے میں کوئی ایسا اختیار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے نام الاٹمنٹیں کر کر کے، درآمدی برآمدی لائسنس بانٹ بانٹ کر، پاسپورٹ دے دے کر، ان کی سفارشوں پر ان کے کام بنا بنا کر، یا ان کی آزادیوں اور ان کی عزتوں پر چھاپے مار مار کر ان کو اپنا حمایتی اور قصیدہ خواں بنا رکھے۔ وہ جن سازش میں کوئی درک نہیں رکھتا کہ لوگوں کو شر پسندانہ نجوی کے ذریعے باہم دگر توڑ توڑ کر اپنے اثر و رسوخ کا راستہ نکالے۔ یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جس نے مولانا مودودی کو ایک نمایاں حیثیت دے دی ہے۔

ایک متاعِ ایمان! ایک نورِ علم! ایک دعوتِ حق! ایک نظریہ و اصول! ایک پاکیزہ مقصد و نصب العین!
ایک نقشۂ تعمیر! ایک جذبۂ خدمت! ایک متاعِ کردار! بس یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!

یہی جوہر ہے جو ایک طرف ہزارہا لوگوں کے لیے مولانا مودودی کی ذات کو انتہائی محبوب بنانے والا ہے اور دوسری طرف یہی وہ جوہر ہے جس کی امانت داری کا قصور اسے بہت سی ہستیوں کی نگاہوں میں انتہائی مبغوض ٹھہرانے والا ہے۔ ایک طرف سے اس کے سامنے بہترین انسانی جذبات اخلاص پیش کیے جاتے ہیں، دوسری طرف سے بدترین گالیوں اور الزامات سے اس کو نوازا جاتا ہے۔ جہاں یہ حقیقت ہے کہ قوم کی ایک بڑی اکثریت اس شخص کی رہائی پر اللہ تعالیٰ کے سامنے شکر گزاری کے جذبات نذر کر رہی ہے، وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ عناصر کے لیے بڑا ہی المناک حادثہ ہے جو ۲۸ اپریل کو اس ملک میں رونما ہوا وہ لوگ بھی ہیں جو اقامتِ دین، اسلامی دستور کے نفاذ، قوم کی ذہنی و اخلاقی تعمیر اور ملک کے استحکام کی جدوجہد میں ذہنی، جسمانی اور مالی تعاون اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور ان کے بالمقابل وہ لوگ بھی ہیں جو مولانا مودودی کے راستے میں روڑے اٹکاتے اور اس کے کام کو نقصان پہنچانے اور لٹریچر عام

کو اس کے اثر سے بچانے کو زندگی کا اَتھل مشن بنا کر ہر ممکن تدبیر عمل میں لا رہے ہیں - اور ایسے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے -

---

اس سلسلے میں مولانا مودودی کے لیے اچھے جذبات رکھنے والے خواص و عوام کو محسوس کرنا چاہیے کہ آج جبکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے موصوف ۲۵ ماہ کی جبری جدائی کے بعد پھر آپ سے آملے ہیں تو مولانا کی ذات سے عقیدتوں اور دلچسپیوں کا اظہار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سوال تو یہ ہے کہ فکر و عمل کی اس فیصلہ کن مہم میں آپ کیا حصہ لیتے ہیں جو مولانا مودودی کے ہاتھوں آغاز پا کر اب ایک منظم تحریک کی صورت میں آپ کے سامنے ہے - حالات نے ایک بڑی نازک آزمائشی صورت ساری قوم کے لیے پیدا کر دی ہے جبکہ ایک طاقت دعوتِ اقامتِ دین کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے اور ایک دوسری طاقت اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے ہے - قوم کی قسمت ــــ اور خود آپ کی قسمت ــــ ان دوگونہ رجحانات کے درمیان معلق ہے - ایسی نازک پوزیشن کے پیدا ہو جانے پر اسلام پر ایمان رکھتے ہوئے آپ کا غیر جانب دار تماشائی بن کر بیٹھے رہنا درحقیقت مخالفِ دین رجحانات کے ہاتھ مضبوط کرنے کے ہم معنی ہے - اس کوتاہی کی تلافی کسی خادمِ دین و ملت کی ذات سے مجرد ذہنی وابستگی رکھنے، اس کے کام پر داد دینے اور اس کا پرجوش استقبال کرنے اور اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دینے سے نہیں ہو سکتی - آگے بڑھیے - حالات کے آثار چڑھاؤ میں کوئی عملی پارٹ ادا کیجیے !!

---

(۲)

سنہ ۵۴ء کے اواخر میں حالات کے چرخے نے اچانک جو الٹی گردش شروع کی تھی اس کے ہر پھیر نے ہمیں نت نئے واقعات و حوادث سے دوچار کیا ہے - اس دوران میں حالات کے ارتقاء کا کوئی اصولی رُخ باقی نہیں رہا۔ تغیرات کی کوئی سمتِ سفر متعین نہیں رہ گئی، سیاست کا جہاز لنگر اور بادبان دونوں سے محروم ہو چکا ہے، سیاستِ ملی کے کسی گوشے ــــ دستوری مرتبے، پارلیمنٹری ہیئت، قانونی انصاف

داخلہ و خارجہ پالیسی — میں حالتِ استقلال (STABILITY) دکھائی نہیں دیتی حیاتِ ملی کی ساری کی ساری متاع اس وقت ہوا کے رُخ بدلتے جھونکوں کے حوالے ہو چکی ہے۔ میدان کارزار کے بڑے بڑے شہسواروں تک کا حال یہ ہو گیا ہے کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"!

تغیر قومی زندگی میں عین شئے مطلوب ہے کیونکہ ترقی اور خیر و فلاح اس کے بغیر ممکن نہیں لیکن بدقسمت ہوتی ہے وہ قوم جس کے ہاں آنے کو تو تغیر ہر صبح اور ہر شام آ رہا ہو لیکن اُس کا ہر بار وہ نئی پستیوں نئی نامرادیوں، نئی پسپائیوں اور نئی پیچیدگیوں اور پریشانیوں کے سیلاب جلو میں لیے وارد ہو۔ افسوس کہ ہمارے ہاں پچھلے دنوں سے حدوث و تغیر کا جو دور شروع ہوا ہے وہ اجتماعی ارادوں اور عوامی رجحانات اور قومی تقاضوں کی طلب کے تحت نہیں، بلکہ ان کے بالکل خلاف اور ان کے بالکل علی الرغم آیا ہے اور اس شان سے آیا ہے کہ اس نے آزادی کے مرتبے، جمہوری روایات، شہری حقوق، سیاسی اخلاق، ملی مقاصد، دستوری قدروں، انتظامی ڈھانچے، دفتری نظم و نسق سب کو ہلا ہلا کے جھنجھوڑا ہے۔ اس نے وہ بندھن ڈھیلے کر دیئے ہیں جن سے کسی قوم کی کتابِ حیات کا شیرازہ بندھا رہتا ہے، اس نے وہ روابط توڑ ڈالے ہیں جو معاشرہ کے مختلف شئون و احوال کو اس کے ماضی اور مستقبل کے درمیان باہم دگر جوڑے رکھتے ہیں اور اس نے وہ بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں جن پر کسی قوم کی بین الاقوامی عزت اور ساکھ کھڑی ہوتی ہے

تاریخ پاکستان کا یہ دورِ تزلزل جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ظہور اور اس کے نشو و ارتقاء میں ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ اس میں ایک پارٹ مسلم لیگ اور اس کی اصول و کردار سے محروم قیادت کا ہے، اس میں ایک پارٹ بغیر کسی اجتماعی نصب العین کے محض حصولِ اقتدار کی کشمکش میں حصہ لینے والی متفرق سیاسی ٹولیوں کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ ابن الوقت قسم کی صحافت کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ جامۂ مذہبیت اوڑھنے والے دنیا طلب حضرات کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ اُن لوگوں کا ہے جن کو محض اتفاقات زمانہ سے اقتدار حاصل ہو گیا ہے۔ اس میں ایک پارٹ مستقل ملازموں کے اونچے طبقے کا ہے، اس میں ایک پارٹ تاجروں کے نمائندوں کا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ایک پارٹ — اور بہت بڑا پارٹ — خود عوام کا ہے۔ یہ سب کے سب اپنے درجے اور

اپنے اپنے عمل کے مطابق اس تقدیر کے بنانے میں حصہ دار اور ذمہ دار ہیں جس سے آج ملک دوچار ہے اور جس کے برگ و بار خود ان حصہ داروں اور ان کی نسلوں کی اپنی جھولیوں ہی میں پڑنے والے ہیں۔

ہم یہاں ان حالات کا کوئی جامع تجزیہ تو نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ ان کے چند عبرتناک پہلوؤں کو ضرور نمایاں کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ ایک امر واقعہ تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو قوت و اختیار کے آخری آمرانہ مراتب پر فائز ہوتے دیکھ کر ہمارے بزرگوں نے جو فولادی عزائم باندھے تھے ان کو حالات کی ٹھوکروں نے بالکل چوراہوں پر اس طرح چکنا چور کیا ہے جیسے وہ کانچ کی چوڑیاں ہوں۔ دنیا نے دیکھا کہ ان عزائم میں بار بار کس طرح ترامیم ہوتی چلی گئیں۔ اور دنیا دیکھ لے گی کہ مستقبل کے لیے جو آہنی ارادے آج پیش کیے جا رہے ہیں ان کا حشر بھی یہی ہو کے رہے گا۔ پھر عبرت اندوز ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس غیر صحت مندانہ ماحول میں عہدے کی کسی کرسی کی طرف جو کوئی بھی لپکا ہے وہ کیسے کیسے وعدے کر کے اور کیسے کیسے بھروسے دلا کر لپکا ہے، لیکن کرسی پر جا کر بیٹھتے ہی ان دعووں اور بھروسوں سمیت برسوں کے قائم شدہ نظریات اور دعووں اور مطالبوں کی آناً فاناً ایسی لاجواب کایا کلپ ہوئی ہے کہ ان حضرات کے بالکل نابینا عقیدت مندوں کی بھی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مدتوں سے بنے ہوئے سیاسی کردار جو قومی خدمات، جدوجہدِ آزادی اور قید و بند کی قربانیوں کے سہرے تلے زیبِ قبا کیے ہوئے تھے ان کا ملمع اقتدار کی کٹھالی میں پہلی آنچ کھاتے ہی کس بری طرح اترا ہے۔ پھر سبق حاصل کرنے کے لیے تیسرا قابلِ مطالعہ پہلو یہ ہے کہ کیسے کیسے بھانت بھانت کے لوگ — جن کے درمیان کسی سیاسی جوڑ میل کا کوئی امکان عقلی موجود نہ تھا — تقدیر کے عطا کردہ موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک ہی خوانِ یغما پر جمع ہو گئے اور کمال یہ کہ جن زبانوں نے کل تک اپنے کچھ حریفوں کو غداری سے کم درجے کے کسی لفظ سے مخاطب نہیں کیا تھا وہ انہی کو خوش آمدید کہنے پر مجبور ہو گئیں۔ لیکن دوسری طرف اس مصنوعی اتحاد کا ایک یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ درون پردہ بھی ان اتحادیوں کے درمیان جب سے اب تک برابر چالیں چلی جا رہی ہیں اور برسرِ عام بھی ہر ایک نے اپنی اپنی ڈفلی بجائی ہے اور اپنا اپنا راگ سنایا ہے۔

پھر جو گوناگوں بول بولے جاتے رہے ہیں ان میں سے کسی ایک کی عمر نے وفا نہ کی۔ بلکہ بڑے سے بڑے بول کا سکہ بھی ہفتہ دو ہفتہ، مہینہ دو مہینہ چل کر کھوٹا ہو گیا۔ ایک ایک کی کہی ہوئی باتوں کو اخبارات سے نکال کے نمبر وار نوٹ کیجیے اور پھر خود ہی معلوم کیجیے کہ کونسی بات کتنے دن چلی! چوتھا پہلو جس کا جائزہ لے کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ مفاد کی کشاکش بڑی تیزی سے اکابر کے طبقہ کا باہمی ائتلاف ختم کیے دے رہی ہے۔ اس کشاکش کی موج جب اٹھتی ہے تو کبھی ۱۹۲ کا وار کرکے بھی جاتی اسمبلی کو اکھاڑ کے پرے پھینک دیتی ہے اور کبھی مرکز کے اشارے کے تحت کسی صوبائی وزارت کا تختہ الٹ دیتی ہے۔ سندھ کے بعد اس کی ایک تازہ سنہری مثال وزارت پنجاب کی اکھیڑ پچھاڑ کا غیر متوقع واقعہ ہے۔ پھر یہ عبرتناک منظر دیکھیے کہ اس طرح کی شاہانہ پھیریوں کا عمل برسرکار جب واقع ہوتا ہے تو چھوٹے چھوٹے لیڈر، صحافی اور ایم ایل اے حضرات کرسی پر آ بیٹھنے والے صاحب منصب کے سامنے قصیدے اور سپاسنامے پیش کرنے لگتے ہیں اور کرسی سے اترنے والے کے خلاف ہجو گوئی کا ایک طوفان کھڑا کرتے ہیں۔ حالانکہ کل تک وہ اس کے قصیدے کہنے میں رطب اللسان رہ چکے اور اس راتوں رات کی قلب ماہیت کی اصل حقیقت پر وہ کوئی پردہ بھی نہیں ڈال سکتے۔ اخلاق کی ادنیٰ ترین سطح سے بھی گرا ہوا یہ سیاسی کردار حکومتی تغیرات کے نمودار ہونے پر نہایت غیر شریفانہ فضا پیدا کر دیتا ہے۔ طرفہ یہ کہ سیاسی پارٹیاں ـــ بشمول حکومت پر فائز ہونے والی متعلقہ پارٹی کے ـــ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے پڑی رہتی ہیں، جیسے یہ ان کا سرے سے موضوع توجہ ہی نہیں! ان حالات میں یہ بالکل واضح ہے کہ کسی کے پاؤں کے نیچے مضبوط زمین اب نہیں ہے۔ اب تو ایوانِ جاہ و منصب بالکل کارواں سرائے کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ مسافر نے رات گزاری، صبح کو کوچ!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیتِ الٰہی نے ہر گروہ اور ہر فرد کی حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ قدرت کے ہاتھ نے مادہ قابلِ ذکر عناصر اور ان کے اندر کی ممتاز خصلتوں کو دور دور سے چن چن کر جمع کر لیا ہے اور اب ایک ایک ہستی کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اسے اسٹیج پر لایا جا رہا ہے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۴	شعبان، رمضان ۱۳۷۴ھ مطابق مئی ۱۹۵۵ء	عدد ۲، ۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ

لاہور سے شائع کیا

اور اسے مجبور کیا جا رہا ہے کہ فکر و عمل اور ذہن و کردار کا جو کچھ سرمایہ تمہارے پاس ہے اسے سب کے سامنے کھول کر رکھ دو۔ اپنی صلاحیتوں کو گن گن کر اور ناپ ناپ کر اور تول تول کر بھری مجلس میں خود بتاؤ کہ تم کیا ہو اور کیا نہیں ہو۔ حوادث کی شیت نے ہماری ٹکسال کے ایک ایک سکے کو جانچنے کے لیے سرِبازار کسوٹیاں نصب کر دی ہیں اور کٹھالیاں آگ پر چڑھا دی ہیں۔ بالکل بیچ کھیت میزان تُل گئی ہے اور اقوال و اعمال تُل رہے ہیں۔ دکھائی یہی دیتا ہے کہ اب کسی کا پردہ نہ رہے گا اور سارے بھرم کھل جائیں گے۔ قوم جن جن کے بارے میں کسی دھوکے میں تھی اور جن جن سے وہ امیدیں وابستہ کر سکتی تھی اب ایسے لوگوں کے ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن بھی لوگوں کی سر کی آنکھوں کے سامنے فاش کیا جانے لگا ہے۔ یہ طرزِ معاملہ قدرت ہمیشہ ایسے عناصر کے ساتھ کرتی ہے جن کی مہلتِ کار کے دن پورے ہو چکے ہیں۔

یہ مرحلہ پراگندگی اور دل ہلا دینے والا مرحلہ ہے، لیکن غالباً اس میں خیر کا سب سے بڑا پہلو یہی ہے کہ پاکستان کے عوام کو خوش فہمیوں اور من گھڑتوں اور وہم و وسوسوں کی تاریکی سے نکال کر حقیقت کے اجالے میں لایا جا رہا ہے جہاں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ کون ان کی بگڑی بنانے میں ان کے کام آ سکتا ہے اور کس کے ہاتھوں جو کچھ بن چکا ہے اس کے بھی تباہ ہو جانے کا خطرہ ہے! اس اتمامِ حجت کے بعد عوام اپنا مستقبل اور اپنا انجام تجویز کرنے کے خود ہی ذمہ دار ہوں گے!

---

(۳)

یہ سوال بڑا قابلِ غور ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے قوم نے کبھی نہیں چاہا کہ وہ ایسے حالات سے دوچار ہو۔ بلکہ اس کے لوگوں نے ہمیشہ اپنے ملک اور اپنی ریاست کے لیے اچھے مستقبل کا تصور باندھا ہے۔ ان حالات کے پیش آ جانے پر بھی کسی ان سے خوش نہیں اور کوئی ان پر مطمئن نہیں، بلکہ ہر شہری کو ان کی وجہ سے اضطراب لاحق ہے اور ہر کوئی ان سے نجات پانا چاہتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا اور جو کچھ ہم نہیں چاہتے وہی ہوتا ہے؟ اور جب یہ حالت ہے

تو مایوسی کے گڑھے میں گر کر قومی خودکشی کر لینے کے سوا اور کونسا چارۂ کار باقی ہے ؟

بات یہ ہے کہ چاہنے کو فرد ہو یا قوم ہر کوئی ہمیشہ اپنا بھلا ہی چاہتا ہے ۔ آرزوئیں ہمیشہ اچھی ہی باندھی جاتی ہیں ، جھونپڑوں میں رہنے والے بھی خواب ہمیشہ محلوں کے دیکھتے ہیں ۔ ہم پاکستانیوں نے بھی حسرتوں اور تمناؤں کی حد تک یہی چاہا ہے کہ ہم دنیا کی عظیم ترین قوموں میں سے ایک ہوں ، ہماری ریاست ایک ترقی پذیر اور خوشحال ریاست ہو ، ہماری ملی آئیڈیالوجی ہمارے ہاتھوں جامۂ عمل پہنے ، اسلامی دستور بنے اور قرآن و سنت کی اساس پر ہمارا محبوب نظام خیر و برکت کارفرما ہو ، اعلیٰ درجے کی جمہوری فضائیں قائم ہوں جس میں ہمارے شہری حقوق محفوظ ہوں ، معاشی استحصال کا خاتمہ ہو جائے ۔ ہمارا انفرادی و اجتماعی کیرکٹر ساری دنیا کے لیے ایک نمونہ و مثال کا کام دینے والا ہو ۔ ہمارا نظم و نسق خیانت ، رشوت اور بے قاعدگیوں سے پاک ہو جائے ، ہمارے اوپر لاگ قانون کی عملداری ہو اور کوئی طاقت دستور کی حدود سے تجاوز نہ کر سکے ۔ ہمارا بچھڑا ہوا کشمیر ہم سے آملے ، ہمارے مہاجر بھائی مکمل طور پر بحالی کی منزل کو پہنچ جائیں اور بہترین بااصول اور بیدار قیادت ہماری زمام کار ہاتھ میں لے ۔

مگر مجرد ان اچھی اچھی باتوں کو چاہنے اور ان کی فہرست ، گفتگوؤں ، تقریروں اور تحریروں میں گنواتے رہنے سے ہزار برس میں بھی کوئی نتیجۂ مطلوب برآمد نہیں ہو سکتا ۔ قومی خواہشوں اور تمناؤں اور مرادوں کے برآنے کی کچھ شرائط ہیں ۔ توفیق ایزدی کے بل پر جو کوئی ان شرائط کو پورا کر دیتا ہے اس کی آرزوئیں پھلتی پھولتی ہیں اور جو کوئی محض پڑے پڑے شیخ چلی کے سے خواب دیکھتا رہتا ہے وہ جب آنکھیں کھولتا ہے تو اس کے تعمیر کردہ شیش محل چکنا چور ہو جاتے ہیں ۔

تو وہ شرائط کیا ہیں ؟

قومی تمناؤں کے بارآور ہونے کی شرط اول یہ ہے کہ گوناگوں متفرق خواہشوں اور تمناؤں اور ضرورتوں کو کسی ایک اصولی و تعمیری نصب العین کی شکل میں ڈھال لیا جائے ۔ انسانی معاشروں سے

زندہ رہنے اور ترقی کرنے، مشکلات پر قابو پانے اور بہترین مستقبل حاصل کرنے کا یہ ایک ناگزیر تقاضا ہے کہ وہ ایک جامع و ہمہ گیر نصب العین اختیار کریں اور فرد فرد کی نگاہیں اس پر مرتکز ہو جائیں۔ اس نصب العین کے لیے ایک گہری محبت اور اس کی طرف بڑھتے چلے جانے کے لیے ایک عام ولولہ ہر طرف کارفرما ہو، کوئی رکاوٹ قوم اور اس کے نصب العین کے درمیان حائل ہو خواہ وہ کوئی غیر ملکی طاقت ہو، چاہے کسی طبقے کا مفاد ہو، چاہے وہ کسی صاحبِ منصب کا اقتدار ہو، چاہے وہ کوئی دستوری تقاضا ہو، اسے راستے سے ہٹا پھینکنے کے لیے اس سرے سے اس سرے تک بے چینی کی لہر دوڑ جائے۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہم بے جڑ کی کھائی قوم نہیں ہیں بلکہ ہماری ایک مضبوط آئیڈیالوجی ہے اور وہ آئیڈیالوجی ہمیں ایک ایسا تعمیری نصب العین دیتی ہے جو ہماری ساری متفرق خواہشوں اور تمناؤں کا جامع ہے۔ اس کو منتہائے نظر بنا کر ہم اگر متحدہ اقدام کریں تو ہم دنیا میں نہ صرف یہ کہ ایک آزاد، خود دار اور ترقی کرنے والی مضبوط قوم اور سلطنت کا سا مقام پیدا کر سکتے ہیں بلکہ امید گاہِ عالم اور مرکزِ انسانیت ہونے کا گم شدہ منصب دوبارہ ہاتھ آ سکتا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارا ایک قلیل عنصر ایڑی چوٹی کا زور اس بات پر لگا رہا ہے کہ قوم کسی طرح اسلامی نصب العین کو عملاً اختیار نہ کرنے پائے۔ پھر اس سے نیچے اتر کر ہمارے خوش حال طبقوں میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کو اپنی نوکری اور تنخواہ، اپنی تجارت اور اپنے پیشے، اپنے سوشل اسٹیٹس اور اپنی تفریحات سے آگے قوم کے بھلے برے سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ بالکل غیر جانب دار، غیر متعلق پڑے مگن ہیں۔ پھر ہمارے تعلیم یافتہ اور ان پڑھ عوام کی بہت بڑی تعداد ہے جو اسلام اور اسلامی دستور اور اسلامی نظامِ حیات کے لیے ایک گونہ دلچسپی تو رکھتی ہے لیکن وہ بس حسرت و آرزو کی حد تک، اسے دل و جان سے اپنا محبوب نصب العین بنا کر متحرک نہیں ہے۔ آخر میں وہ حساس اور ذمہ دار عناصر ہمارے سامنے آتے ہیں جو اسلامی نصب العین کو واقعی نصب العین بنا کر اپنے حصے کا فرض ادا کر رہے ہیں۔

ہم موجودہ ناسازگار حالات کی خطرناکیوں کا واسطہ دلا کر ملک کے ایک ایک فرد سے اپیل کرتے ہیں کہ متفرق خیالی تمناؤں کی سطح سے اوپر اٹھیں اور اسلامی —— یا کوئی —— تعمیری نصب العین

اختیار کریں۔ خواہ کسی کے پیش کردہ نصب العین پر جمع ہوں، خواہ اپنے نصب العین پر دوسروں کو جمع کریں۔ یہ بے نصب العین کی پریشان حال زندگی اب ختم ہو جانی چاہیے۔ سامنے نصب العین نہ ہو تو قومیں چیونٹیوں جیسی کثیر تعداد میں ہو کر بھی بے تغیر پڑی رہتی ہیں، اور تغیر ان پر آتا بھی ہے تو اور زیادہ پستی اور تباہی میں دھکیل دینے کے لیے آتا ہے۔

قوموں کی آزادی، ریاستوں کی ترقی اور معاشروں کے استحکام کے لیے دوسرا اہم لازمہ تنظیم ہے۔ حیاتِ اجتماعی کا یہ اتنا بڑا تقاضا ہے کہ علمائے سیاست نے ریاست کے عناصرِ خمسہ میں اسے شمار کیا ہے۔ جس انسانی آبادی میں تعاون، ائتلاف، یک جہتی، ہم آہنگی اور تنظیم کے داعیات کارفرما نہ ہوں وہ اول تو ریاست کے مرتبے پر آ نہیں سکتی اور اگر بخت و اتفاق نے اسے اٹھا کر تختِ آزادی پر بٹھا بھی دیا ہو تو وہ کسی بھی لمحے تخت پر سے اچانک گرے گی اور سیدھی غلامی کی گود میں جا پہنچے گی۔ اس کو غلام بنانے کے لیے باہر کی کوئی قوتِ قاہرہ اگر نہ بھی متوجہ ہو تو اس کے اندر سے اس کے اپنے ہی فرزند اٹھیں گے اور اس کے سر سے تاجِ اقتدار، اس کے کندھوں سے شاہی قبا، اس کے ہاتھوں سے عصائے سطوت، اور اس کے قلمدان سے مہرِ فرماں روائی دیکھتے دیکھتے اچک لیں گے اور اس ساری متاعِ گراں بہا کو بیچ بٹا کر کھا پی جائیں گے۔ ایک غیر منظم قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی آزادی پر ہاتھ صاف کرنے والی اندرونی طاقتیں جب اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو وہ خنجر کی دلیل سے بات کرتی ہیں، وہ تشدد کے قانون سے قسمتوں کا فیصلہ کرتی ہیں، وہ سازش کے ذریعے جڑیں پھیلاتی ہیں اور کسی کو اُف کرنے کا موقع نہیں دیتیں۔ کروڑوں افراد کا غیر منظم انبوہ یہ سب کچھ ہوتا دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ منتشر افراد سیاسی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے، وہ محض بھیڑ بکریاں ہوتے ہیں —— پڑھی لکھی اور ڈگریاں رکھنے والی بھیڑ بکریاں، فلسفی اور سیاست دان بھیڑ بکریاں، سوٹ بوٹ اور شیروانی پاجاموں میں ملبوس بھیڑ بکریاں! بڑے سے بڑے انبوہِ گوسفنداں کے لیے یہ کافی ہے کہ کوئی بھی زید، عمر، بکر آمریت کا لٹھ کندھے پر رکھے نمودار ہو اور ان کا چرواہا بن کر ان کو جدھر چاہے ہانک لے۔ وہ مزے سے ان کا دودھ

پہنچے، ان کا گزشتہ کیا ہے، ان کی اُڑان سے قائدین بیوا ہے اور ان کو اور ان کے بچوں کو نقصانوں کے ہاتھ بیچتا رہے، جبیر بکریوں سے بغیر اس کے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ جو بھی کسی نہ کسی طرح ان کا چرواہا بن گیا ہو وہ اسی کے آگے تھوتھنی ٹکا کر ممیا دیں۔

امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس، چین، انڈیا اور دوسری قومیں اگر ترقی کرتی ہوئی زندہ قومیں ہیں تو محض اس لیے کہ ان کی آبادیاں پارٹیوں کی شکل میں منظم ہیں اور سالہا سال سے منظم چلی آ رہی ہیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ مسلم لیگ اپنے گناہوں اور اپنی کوتاہیوں کی برکت سے درہم برہم ہو چکی۔ اس کی جگہ لینے کے لیے طالع آزما عناصر کسی اصول و مقصد اور کردار کے بغیر گوناگوں ٹولیاں بنا کر اُٹھے لیکن عوام کو اپنی طرف جذب کرنے میں ناکام رہے۔ خود تو ناکام رہے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اپنا پورا زور اس پر صرف کر دیا کہ لوگ اگر ان کے ساتھ نہیں آ رہے تو کسی دوسری بہتر تنظیم سے بھی نہ جڑنے پائیں۔ یہ عناصر قوم کو ایک مستقل پریشانی و انتشار میں ڈال دینے پر تل گئے۔ اب دیکھ لیجیے کہ نتیجہ کیا ہے۔

اب وقت پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہر شخص چونکے اور اپنے آپ کو کسی منظم طاقت سے ملحق کرے۔ اپنے نصب العین کو سامنے رکھ کر دیکھیے کہ اس کے تقاضے موجودہ تنظیموں میں سے کس کے ساتھ ہو کر پورے کیے جا سکتے ہیں۔ پھر جس پر دل ٹھکے اپنے آپ کو اس کے شیرازہ میں پرو دیجیے۔ نصب العین اسلامی ہے تو جماعت اسلامی ایک مضبوط مرکز (NUCLEUS) کی حیثیت میں سامنے موجود ہے، اور قوم کے اجتماعی رجحانات کا اشارہ اب اسی طرف ہے۔ اس سے بہتر کوئی اور نظم دکھائی دے تو اس سے جا ملیے۔ نصب العین کوئی دوسرا ہو تو اس کے مطابق کوئی دوسری موزوں تنظیم ڈھونڈیے۔ موجودہ تنظیموں میں سے کسی کے ساتھ ہم آہنگی (COMPROMISE) ممکن نہ ہو تو بسم اللہ کسی نئی تنظیم کی نیو ڈالیے۔ بہرحال اب اس حالت انتشار کو ختم ہونا چاہیے جو ایسے احوال کو پیدا ہونے کا موقع دیتی ہے کہ جن کے ہاتھوں نہ ہماری آزادی سلامت رہ سکتی ہے، نہ ہمارے تعمیری منصوبوں اور ترقی کے عزائم کی خیر ہے۔

کوئی تنظیمی طاقت بغیر ایک موزوں لیڈر شپ کے نہیں اُبھر سکتی اور وجود پذیر ہو بھی جائے تو بھی ایک فعال طاقت نہیں بن سکتی۔ نصب العین اگر تنظیم کا تقاضا کرتا ہے تو تنظیم صاحب صلاحیت قائد مانگتی ہے۔ جیسے ایک آزاد سلطنت کے حصول کا نصب العین جب قوم نے اپنایا تو اس نے مسلم لیگ کی تنظیم کے تحت اپنے آپ کو سمیٹا اور قائد اعظم کی شخصیت کو رہنمائی کے منصب پر رکھا۔ اسی طرح اب اگر اسلامی آئیڈیالوجی پر معاشرہ کی تعمیر نو کا نصب العین قرار پایا ہے تو اس کے حصول کے لیے جہاں کسی موزوں نظام جماعت کا انتخاب ضروری ہے وہاں دوسری ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ یہ کام جس طرح کا لیڈر مانگتا ہے وہ دستیاب ہو۔

قوموں کی امامت اور سلطنتوں اور معاشروں کی تعمیر و ترقی کا کام جس نوعیت کا لیڈر مانگتا ہے اس کی پہچان یہ نہیں ہوتی کہ وہ بڑی چابکدستی سے کسی عہدے پر جا بیٹھا ہے۔ اس نے کسی انتخاب میں حریفوں کو پچھاڑ کر اسمبلی کی نشست جیت لی تھی، اس نے کوئی بیراج بنوا دیا ہے یا بجلی اور شکر کا کوئی کارخانہ کھلوا دیا ہے۔ یا وہ کوئی بڑی برادری اور جاگیر رکھتا ہے۔ قوموں کو بنانے والے لیڈروں میں دیکھنے کے پہلو یہ ہوتے ہیں کہ کیا وہ کوئی جامع اصول و نظریہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ کوئی قابل عمل پروگرام اس کے پیش نظر ہے، مضبوط کیرکٹر اس میں پایا جاتا ہے، ثبات اور استقلال ہے، قربانی دینے کا حوصلہ ہے، دیانت و امانت اور بے لوثی کی صفت ہے۔ اس معیار کا چراغ لے کر ڈھونڈیے کہ آیا آپ کے آٹھ کروڑ افراد میں اس صلاحیت کا کوئی اکا دکا فرد ہاتھ آسکتا ہے۔ دنیا کی کوئی پست سے پست قوم شاید اتنی گئی گزری نہ ہوگی کہ وہ اپنے اجتماعی نصب العین کی طرف اقدام کرنے کے لیے اپنی ضرورت کا کوئی لیڈر نہ پا سکے۔ اتنے گئے گزرے یقیناً ہم نہیں ہیں لیکن مشکل جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ اس متوقع پارٹ کا ادا کرنے والا ہے بھی تو آپ کا پریس، آپ کے لیڈر اور آپ کے بعض اکابر ہر ممکن تدبیر کے ذریعے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ قوم کسی ایسے شخص تک پہنچنے اور اس سے اپنے آپ کو مربوط نہ کرنے پائے۔

آپ کی ہمسایہ قوم کو جن چیزوں نے مسابقت حیات میں آگے کر دیا ہے ان میں سے ایک یہ تھی

کو شرمندہ سے اس نے ایک لیڈر کا دامن تھاما اور اس کے گرد سمٹ گئی۔ گاندھی جی سے ان کے فلسفے اور ان کے سیاسی طریق کار میں اگر ایک ایک جزئی اختلاف پر مختلف عناصر مخالفتیں برپا کیے رہتے، ہر ذہین آدمی ان سے حریفانہ اور رقیبانہ معاملہ کرتا اور پریس اگر شروع سے ان کا بائیکاٹ کرتا اور ان کا مضحکہ اڑاتا رہتا تو گاندھی جی قومی لیڈری کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود قومی ہیرو نہ بنتے، مگر دوسری طرف قوم بھی اس سطح پر نہ پہنچ پاتی جس پر وہ آج ہے۔ اس ہمسایہ قوم کے بخلاف مسلمانوں کی یہ ایک مستقل کمزوری رہی ہے کہ وہ کسی ایک قیادت پر مٹنے پر تیار نہیں ہوتے اور ان کا ہر ذہین آدمی اس جہاد میں لگا رہتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص قومی قیادت کا مقام حاصل نہ کرنے پائے۔ قوم صرف ایک مرتبہ قائداعظم کے ساتھ جمع ہوئی اور اس کے نتیجے میں اسے پاکستان حاصل ہوگیا۔ اب وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق پھر منتشر ہے تو اس کا حال یہ ہے کہ پچھلی جدوجہد میں جو کچھ کمایا تھا اس کی حفاظت بھی مشکل ہو رہی ہے۔

اب اگر زندہ رہنا ہے تو ہمیں اس کمزوری کو دور کرنا ہوگا اور وقت متنبہ کر رہا ہے کہ اس کمزوری کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھنا تو در کنار، اندیشہ ہے کہ فطرت کے بے لاگ قوانین آپ کو اٹھا کر اور پیچھے نہ پھینک دیں۔ موجودہ حالتِ انتشار اگر قائم رہے تو کسی نجات دہندۂ ملت کی مسیحائی اور کسی محافظِ قوم کی پاسبانی پاکستان کو خطرات سے نکال نہیں سکتی، لیکن اگر اس حالتِ انتشار کی دلدل سے نکلنے کی عملی تدابیر خود قوم اختیار کرے تو پھر آمریت پسند اور جاہ طلب حضرات کی مہلک سے مہلک وقتی کارروائیوں کے نتائج کا سدِ باب کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا، استحکام اور ترقی کے لیے اپنی فوری ضروریات کو پھر ذہن نشین کر لیجیے — ایک جامع تعمیری نصب العین — ایک مضبوط اصولی تنظیم — ایک صاحب کردار لیڈر!

تفہیم القرآن

طٰہٰ

(۲)

ان صفحات میں تفہیم القرآن کی اشاعت کا سلسلہ جون ۱۹۵۳ء کے بعد سے بند رہا ہے جس کے اسباب ناظرین کو خود ہی معلوم ہیں۔ آخری قسط جو ماہ جون ۱۹۵۳ء کے پرچے میں شائع ہوئی تھی اس میں سورۂ طٰہٰ کے دوسرے رکوع تک سلسلہ پہنچ چکا تھا۔ آگے جیل کے زمانۂ قیام میں جس قدر کام ہوا ہے اسے انشاء اللہ بڑی بڑی قسطوں میں شائع کر کے جلدی ہی ناظرین تک پہنچا دیا جائے گا تاکہ کسی حد تک اس تشنگی کی تلافی ہو سکے جو پچھلے ۲۵ مہینوں کے دوران میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ تمام ناظرین سے بالعموم اور اہل علم حضرات سے بالخصوص گزارش ہے کہ ترجمانی و تفسیر میں جو غلطی، لغزش یا کوتاہی محسوس فرمائیں اس سے مجھے آگاہ فرما دیں تاکہ کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے اس کی اصلاح کر سکوں۔

ابوالاعلیٰ

فرعون[۲۰] نے کہا "اچھا، تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ[۲۱]؟

۲۰۔ یہاں قصے کی ان تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کس طرح فرعون کے پاس پہنچے اور کس طرح اپنی دعوت اس کے سامنے پیش کی۔ یہ تفصیلات سورۂ اعراف رکوع ۱۳ میں گزر چکی ہیں اور آگے سورۂ شعراء رکوع ۲-۳، سورۂ قصص رکوع ۴، اور سورۂ نازعات رکوع ۱ میں آنے والی ہیں۔

فرعون کے متعلق مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۶۴-۶۵

۲۱۔ دونوں بھائیوں میں سے اصل صاحبِ دعوت چونکہ موسیٰ علیہ السلام تھے اس لیے فرعون نے انہی کو مخاطب کیا

موسیٰ نے جواب دیا "ہمارا رب وہ ہے[۲۲] جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو

اور ہوسکتا ہے کہ خطاب کا رُخ اُن کی طرف رکھنے سے اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ حضرت ہارون کی فصاحت و بلاغت کو میدان میں آنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہو اور حضرت موسیٰ کی اُس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو جس کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

فرعون کے اس سوال کا منشا یہ تھا کہ تم دونوں کسے رب بنا بیٹھے ہو، مصر اور اہلِ مصر کا رب تو میں ہوں۔ سورۂ نازعات میں اُس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى "اے اہلِ مصر تمہارا ربِّ اعلیٰ میں ہوں"۔ سورۂ زخرف میں وہ بھرے دربار کو مخاطب کر کے کہتا ہے يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ "اے قوم، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہ رہی ہیں؟" (رکوع ۵)۔ سورۂ قصص میں وہ اپنے درباریوں کے سامنے یوں نکارتا ہے يٰاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ، فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى "اے سردارانِ قوم، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور بھی الٰہ ہے، اے ہامان، ذرا اینٹیں پکوا اور ایک بلند عمارت میرے لیے تیار کرا تاکہ میں ذرا اوپر چڑھ کر دیکھوں تو سہی کہ یہ موسیٰ کسے الٰہ بنا رہا ہے" (رکوع ۴)۔ سورۂ شعراء میں وہ حضرت موسیٰ کو ڈانٹ کر کہتا ہے لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ "اگر تو نے میرے سوا کسی کو الٰہ بنایا تو یاد رکھ کہ تجھے جیل بھیج دونگا" (رکوع ۲)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرعون اپنی قوم کا واحد معبود تھا اور وہاں اس کے سوا کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ فرعون خود سورج دیوتا (رع یا راع) کے اوتار کی حیثیت سے بادشاہی کا استحقاق جتاتا تھا اور یہ بات بھی مصر کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس لیے فرعون کا دعویٰ "واحد مرکز پرستش" ہونے کا نہ تھا، بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریے کے اعتبار سے دراصل پوری نوع انسانی کی سیاسی ربوبیت کا مدعی تھا اور یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس کے اُوپر کوئی دوسری ہستی فرمانروا ہو جس کا نمائندہ آکر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے۔

۲۲ یعنی ہم ہر معنی میں صرف اُس کو رب مانتے ہیں۔ پروردگار، آقا، مالک، حاکم، سب کچھ ہمارے نزدیک

راستہ بتایا"۔ [۲۳]

وہی ہے۔ کسی معنی میں بھی اُس کے سوا کوئی دوسرا رب ہمیں تسلیم نہیں ہے۔

[۲۳] یعنی دنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اُسی کے بنانے سے بنی ہے۔ ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل و صورت، جو قوت و صلاحیت، اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے، اُسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو دنیا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اس کو دی، اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی، ہر ایک چیز کو اُس نے وہ صورت خاص عطا کی ہے جو اسے کائنات میں اپنے حصے کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔

پھر اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو، بلکہ اس کے بعد وہی ان سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اس نے نہ سکھایا ہو۔ کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا اسی نے سکھایا ہے۔ مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا اسی کی تعلیم سے آیا ہے۔ درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اگانے کی ہدایت اسی نے دی ہے۔ غرض وہ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں، ہادی اور معلم بھی ہے۔

اس بے نظیر جامع و مختصر جملے میں حضرت موسیٰ نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ان کا رب کون ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ کیوں رب ہے اور کس لیے اُس کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانا جا سکتا۔ دعوے کے ساتھ اس کی دلیل بھی اسی چھوٹے سے فقرے میں آگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فرعون اور اس کی رعایا کا ہر فرد اپنے وجودِ خاص کے لیے اللہ کا ممنونِ احسان ہے، اور جب ان میں سے کوئی ایک لمحہ کے لیے زندہ تک نہیں رہ سکتا جب تک اس کا دل اور اس کے پھیپھڑے اور اس کا معدہ و جگر اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے اپنا کام نہ کیے چلے جائیں، تو فرعون کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب ہے، اور لوگوں کا یہ ماننا کہ وہ واقعی ان کا رب ہے، ایک حماقت اور ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مزید براں، اِسی ذرا سے فقرے میں حضرت موسیٰ نے اشارۃً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی جس کے ماننے سے فرعون کو انکار تھا۔ اُن کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا ہادی ہے، اور جو ہر چیز کو اس کی

فرعون بولا "اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں اُن کی پھر کیا حالت تھی؟"[۲۴]
موسیٰ نے کہا "اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔"[۲۵]

حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے۔ اُس کے عالمگیر منصبِ ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لیے بھی رہنمائی کا انتظام کرے۔ اور انسان کی شعوری زندگی کے لیے رہنمائی کی وہ شکل موزوں نہیں ہو سکتی جو مچھلی اور مرغی کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اس کی موزوں ترین شکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہو اور وہ ان کی عقل و شعور کو اپیل کر کے انہیں سیدھا راستہ بتائے۔

۲۴۔ یعنی اگر بات یہی ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور زندگی میں کام کرنے کا راستہ بتایا اس کے سوا کوئی دوسرا رب نہیں ہے، تو یہ ہم سب کے باپ دادا جو صدہا برس سے نسل در نسل دوسرے ارباب کی بندگی کرتے چلے آرہے ہیں، ان کی تمہارے نزدیک کیا پوزیشن ہے؟ کیا وہ سب عذاب کے مستحق تھے؟ کیا اُن سب کی عقلیں ماری گئی تھیں؟ یہ تھا فرعون کے پاس حضرت موسیٰ کی اس دلیل کا جواب۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جواب اُس نے بربنائے جہالت دیا ہو، اور ہو سکتا ہے کہ بربنائے شرارت۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں دونوں باتیں شامل ہوں یعنی وہ خود بھی اس بات پر جھلا گیا ہو کہ اِس مذہب سے ہمارے تمام بزرگوں کی گمراہی لازم آتی ہے، اور ساتھ ساتھ اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ اپنے اہلِ دربار اور عام اہلِ مصر کے دلوں میں حضرت موسیٰ کی دعوت کے خلاف ایک تعصب بھڑکا دے۔ اہلِ حق کی تبلیغ کے خلاف یہ ہتھکنڈا ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور جاہلوں کو مشتعل کرنے کے لیے بڑا موثر ثابت ہوا ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ قرآن کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں، مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے سب سے زیادہ اسی ہتھکنڈے سے کام لیا جا رہا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کی اس مکاری کا ذکر یہاں بالکل برمحل تھا۔

۲۵۔ یہ ایک نہایت ہی حکیمانہ جواب ہے جو حضرت موسیٰ نے اُس وقت دیا اور اس سے حکمتِ تبلیغ کا ایک بہترین سبق حاصل ہوتا ہے۔ فرعون کا مقصد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سامعین کے، اور اُن کے توسط سے پوری قوم کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ کہتے کہ ہاں وہ سب جاہل اور گمراہ تھے اور سب کے سب جہنم کا ایندھن بنیں گے تو چاہے یہ حق گوئی کا بڑا زبردست نمونہ ہوتا، مگر یہ جواب حضرت موسیٰ کے بجائے فرعون کے مقصد

---وہی ^۲۶^ جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور اُس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے، اور اوپر سے پانی برسایا، پھر اُس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے ^۲۷^۔ اِسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اِسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اِسی سے تم کو دوبارہ نکالیں ^۲۸^ گے ع

کی زیادہ مذمت انجام دنیا؟ اس لیے آنجناب نے کمال دانائی کے ساتھ ایسا جواب دیا جو بجائے خود حق بھی تھا، اور ساتھ ساتھ اس نے فرعون کے زہریلے دانت بھی توڑ دیے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جیسے کچھ بھی تھے، اپنا کام کر کے خدا کے ہاں جا چکے ہیں۔ میرے پاس ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگاؤں۔ ان کا پورا ریکارڈ اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ ان کی ایک ایک حرکت اور اس کے محرکات کو خدا جانتا ہے۔ نہ خدا کی نگاہ سے کوئی چیز بچی رہ گئی ہے اور نہ اس کے حافظہ سے کوئی شے محو ہوئی ہے۔ ان سے جو کچھ بھی معاملہ خدا کو کرنا ہے اس کو وہی جانتا ہے۔ مجھے اور تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ ان کا موقف کیا تھا اور ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہمیں تو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہمارا موقف کیا ہے اور ہمیں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

^۲۶^ انداز کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا جواب "نہ بھولتا ہے" پر ختم ہو گیا، اور یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور شرح و تذکیر ارشاد ہوئی ہے۔ قرآن میں اس طرح کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ کسی گذرے ہوئے یا آئندہ پیش آنے والے واقعے کو بیان کرتے ہوئے جب کسی شخص کا کوئی قول نقل کیا جاتا ہے، تو اس کے بعد متصلاً چند فقرے وعظ و پند یا شرح و تفسیر، یا تفصیل و توضیح کے طور پر مزید ارشاد فرمائے جاتے ہیں اور صرف انداز کلام سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اُس شخص کا قول نہیں ہے جس کا پہلے ذکر ہو رہا تھا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول ہے۔

واضح رہے کہ اس عبارت کا تعلق صرف قریب کے فقرے "میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے" سے ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کے پورے کلام سے ہے جو رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ سے شروع ہوا ہے۔

^۲۷^ یعنی جو لوگ عقل سلیم سے کام لے کر جستجوئے حق کرنا چاہتے ہوں وہ ان نشانات کی مدد سے منزل حقیقت تک پہنچنے کا راستہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ نشانات اس کو بتا دیں گے کہ اس کائنات کا ایک رب ہے اور ربوبیت ساری

ہم نے فرعون کو اپنی سب ہی نشانیاں دکھائیں[۲۹] مگر وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہ مانا۔ کہنے لگا " اے
موسیٰ، کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرے[۳۰]

کی ساری اسی کی ہے کسی دوسرے رب کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

[۲۸] یعنی ہر انسان کو لازماً تین مرحلوں سے گزرنا ہے۔ ایک مرحلہ موجودہ دنیا میں پیدائش سے لیکر موت تک کا۔ دوسرا مرحلہ موت سے قیامت تک کا۔ اور تیسرا قیامت کے روز دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کا مرحلہ۔ یہ تینوں مرحلے اس آیت کی رُو سے اسی زمین پر گزرنے والے ہیں۔

[۲۹] یعنی آفاق و انفس کے دلائل کی نشانیاں بھی، اور وہ معجزات بھی جو حضرت موسیٰ کو دیے گئے تھے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر حضرت موسیٰ کی وہ تقریریں بھی موجود ہیں جو انہوں نے فرعون کو سمجھانے کے لیے کیں۔ اور وہ معجزات بھی مذکور ہیں جو اس کو پے در پے دکھلائے گئے۔

[۳۰] جادو سے مراد عصا اور ید بیضا کا معجزہ ہے جو سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء کی تفصیلات کے بموجب حضرت موسیٰ نے پہلی ہی ملاقات کے وقت بھرے دربار میں پیش کیا تھا۔ اس معجزے کو دیکھ کر فرعون پر جو بدحواسی طاری ہوئی اس کا اندازہ اس کے اسی فقرے سے کیا جا سکتا ہے کہ "تو اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے"۔ دنیا کی تاریخ میں نہ پہلے کبھی یہ واقعہ پیش آیا تھا نہ بعد میں کبھی پیش آیا کہ کسی جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے کوئی ملک فتح کر لیا ہو۔ فرعون کے اپنے ملک میں سینکڑوں ہزاروں جادوگر موجود تھے جو تماشے دکھا دکھا کر انعام کے لیے ہاتھ پھیلاتے پھرتے تھے۔ اس لیے فرعون کا ایک طرف یہ کہنا کہ تو جادوگر ہے، اور دوسری طرف یہ خطرہ ظاہر کرنا کہ تو میری سلطنت چھین لینا چاہتا ہے، کھلی ہوئی بدحواسی کی علامت ہے۔ دراصل وہ حضرت موسیٰ کی معقول و مدلل تقریر، اور پھر ان کے معجزے کو دیکھ کر یہ سمجھ گیا تھا کہ نہ صرف اس کے اہل دربار، بلکہ اس کی رعایا کے بھی عوام و خواص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اس لیے اس نے جھوٹ اور فریب اور تعصبات کی انگیخت سے کام نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ یہ معجزہ نہیں جادو ہے اور ہماری سلطنت کا ہر جادوگر اسی طرح لاٹھی کو سانپ بنا کر دکھا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگو، تمہارے باپ دادا کو گمراہ اور جہنمی ٹھیراتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگو ہوشیار ہو جاؤ، یہ پیغمبر ویغمبر کچھ نہیں ہے، اقتدار کا بھوکا ہے، چاہتا ہے کہ

اچھا، ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادو لاتے ہیں۔ طے کر لے کب اور کہاں مقابلہ کرنا ہے۔ نہ ہم اس قرارداد سے پھریں گے نہ تو پھر یو۔ کھلے میدان میں سامنے آجا۔"

موسیٰ نے کہا "جشن کا دن طے ہوا، اور دن چڑھے لوگ جمع ہوں۔"[۳۱]

فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کیے اور مقابلے میں آگیا۔[۳۲]

یوسفؑ کے زمانے کی طرح پھر بنی اسرائیل یہاں حکمراں ہو جائیں اور قبطی قوم سے سلطنت چھین لی جائے۔ ان ہتھکنڈوں سے وہ دعوتِ حق کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔

مزید تشریحات کے لیے تفہیم القرآن جلد دوم کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں۔ صفحہ ۶۵ تا ۶۸۔ اور صفحہ ۴۰۲

۳۱ فرعون کا مدعا یہ تھا کہ ایک دفعہ جادوگروں سے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنوا کر دکھا دوں تو موسیٰؑ کے معجزے کا جو اثر لوگوں کے دلوں پر ہوا ہے وہ دور ہو جائے گا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی منہ مانگی مراد تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ الگ کوئی دن اور جگہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جشن کا دن قریب ہے، جس میں تمام ملک کے لوگ دارالسلطنت میں کھنچ کر آجاتے ہیں۔ وہیں میلے کے میدان میں مقابلہ ہو جائے تاکہ ساری قوم دیکھ لے۔ اور وقت بھی دن کی پوری روشنی کا ہونا چاہیے تاکہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

۳۲ فرعون اور اس کے درباریوں کی نگاہ میں اس مقابلے کی اہمیت یہ تھی کہ وہ اس کے فیصلے پر اپنی قسمت کا فیصلہ معلق سمجھ رہے تھے۔ تمام ملک میں آدمی دوڑا دیئے گئے کہ جہاں جہاں کوئی ماہر جادوگر موجود ہو اُسے لے آئیں۔ اسی طرح عوام کو بھی جمع کرنے کی خاص طور پر ترغیب دی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اکٹھے ہوں اور اپنی آنکھوں سے جادو کے کمالات دیکھ کر عصائے موسیٰ کے رعب سے محفوظ ہو جائیں۔ کھلم کھلا کہا جانے لگا کہ ہمارے دین کا انحصار اب جادوگروں کے کرتب پر ہے۔ وہ جیتیں تو ہمارا دین بچے گا، ورنہ موسیٰ کا دین چھا کر رہے گا (ملاحظہ ہو سورۂ شعراء، رکوع ۳)

اس مقام پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مصر کے شاہی خاندان اور طبقۂ امراء کا مذہب عوام کے مذہب سے کافی مختلف تھا۔ دونوں کے دیوتا اور مندر الگ الگ تھے، مذہبی مراسم بھی یکساں نہ تھے، اور زندگی بعد موت کے معاملہ میں بھی، جس کو مصر میں بہت بڑی اہمیت حاصل تھی، دونوں کے عملی طریقے اور نظری انجام میں بہت بڑا امتیاز پایا جاتا تھا۔ (ملاحظہ ہو TOYNBEE کی A STUDY OF HISTORY صفحہ ۳۱-۳۲)۔ علاوہ بریں مصر میں اس سے پہلے

موسیٰ نے (عین موقع پر گروہِ مقابل کو مخاطب کر کے) کہا[۴۳] "شامت کے مارو، نہ جھوٹی تہمتیں باندھو اللہ پر[۴۴]، ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمہارا ستیاناس کر دے گا۔ جھوٹ جس نے بھی گھڑا وہ نامراد ہوا۔" یہ سن کر ان کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے[۴۵]۔ آخر کار کچھ لوگوں نے کہا کہ[۴۶] "یہ دونوں تو محض جادوگر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے

جو مذہبی انقلابات رونما ہوئے تھے ان کی بدولت وہاں کی آبادی میں متعدد ایسے عناصر پیدا ہو چکے تھے جو ایک مشرکانہ مذہب کی بہ نسبت ایک توحیدی مذہب کو ترجیح دیتے تھے یا دے سکتے تھے۔ مثلاً خود بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب لوگ آبادی کا کم از کم دس فی صدی حصہ تھے۔ اس کے علاوہ اُس مذہبی انقلاب کو ابھی پورے ڈیڑھ سو برس بھی نہ گزرے تھے جو فرعون اَمینوفس یا اَخناتون (۱۳۷۷ تا ۱۳۶۰ ق م) نے حکومت کے زور سے برپا کیا تھا، جس میں تمام معبودوں کو ختم کر کے صرف ایک معبود آتون باقی رکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس انقلاب کو بعد میں حکومت ہی کے زور سے اُلٹ دیا گیا، مگر کچھ نہ کچھ تو اپنے اثرات وہ بھی چھوڑ گیا تھا۔ ان حالات کو نگاہ میں رکھا جائے تو فرعون کی وہ گھبراہٹ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جو اس موقع پر اسے لاحق تھی۔

[۴۳] یہ خطاب عوام سے نہ تھا جنہیں ابھی حضرت موسیٰ کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ معجزہ دکھانے میں یا جادو، بلکہ خطاب فرعون اور اس کے درباریوں سے تھا جو انہیں جادوگر قرار دے رہے تھے۔

[۴۴] یعنی اُس کے معجزے کو جادو اور اس کے پیغمبر کو ساحر کذّاب نہ قرار دو۔

[۴۵] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنی کمزوری کو خود محسوس کر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ حضرت موسیٰ نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے اس مقابلے میں ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے آئے تھے، اور جب عین موقع پر حضرت موسیٰ نے ان کو للکار کر متنبہ کیا تو ان کا عزم یکایک متزلزل ہو گیا۔ اُن کا اختلاف رائے اسی امر میں ہوا ہو گا کہ آیا اس بڑے تہوار کے موقع پر، جبکہ پورے ملک سے آئے ہوئے آدمی اکٹھے ہیں، کھلے میدان اور دن کی پوری روشنی میں یہ مقابلہ کرنا ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر یہاں ہم شکست کھا گئے اور سب کے سامنے جادو اور معجزے کا فرق کھل گیا تو پھر بات سنبھالے نہ سنبھل سکے گی۔

[۴۶] اور یہ کہنے والے لازماً فرعونی پارٹی کے وہ سر پھرے لوگ ہوں گے جو حضرت موسیٰ کی مخالفت میں ہر بازی کھیل

پیے دخل کر دیں اور تمہارے مثالی طریقِ زندگی کا خاتمہ کر دیں[۳۷]۔ اپنی ساری تدبیریں آج اکٹھی کر لو اور ایکا کر کے میدان میں آؤ[۳۸]۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج جو غالب رہا وہی جیت گیا۔"

[۳۹] جادوگر بولے "موسیٰ، تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟"

موسیٰ نے کہا "نہیں، تم ہی پھینکو۔"

یکایک اُن کی رسیاں اور اُن کی لاٹھیاں اُن کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں[۴۰]، اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا[۴۱]۔ ہم نے کہا "مت ڈر، تو ہی غالب رہے گا۔ پھینک جو کچھ تیرے

جانے پر آمادہ تھے۔ جہاندیدہ اور معاملہ فہم لوگ قدم آگے بڑھاتے ہوئے جھجک رہے ہونگے۔ اور یہ سر پھرے جوشیلے لوگ کہتے ہونگے کہ خواہ مخواہ کی دور اندیشیاں چھوڑو اور جی کڑا کر کے مقابلہ کر ڈالو۔

[۳۷] یعنی اِن لوگوں کا دار و مدار دو باتوں پر تھا۔ ایک یہ کہ اگر جادوگر بھی موسیٰ کی طرح لاٹھیوں سے سانپ بنا کر دکھا دیں گے تو موسیٰ کا جادوگر ہونا مجمعِ عام میں ثابت ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ مذہبی اور سیاسی تعصب کی آگ بھڑکا کر حکمراں طبقے کو اندھا جوش دلانا چاہتے تھے اور یہ خوف انہیں دلا رہے تھے کہ موسیٰ کا غالب آجانا تمہارے ہاتھوں سے ملک نکل جانے اور تمہارے مثالی ر (IDEAL) طریقِ زندگی کے ختم ہو جانے کا ہم معنی ہے۔

[۳۸] یعنی اِن کے مقابلے میں متحدہ محاذ پیش کرو۔ اگر اس وقت تمہارے درمیان آپس ہی میں پھوٹ پڑ گئی اور عین مقابلے کے وقت مجمعِ عام کے سامنے یہ ہچکچاہٹ اور سرگوشیاں ہونے لگیں تو ابھی ہوا اکھڑ جائے گی اور لوگ سمجھ لیں گے کہ تم خود اپنے حق پر ہونے کا یقین نہیں رکھتے، بلکہ دلوں میں چور لیے ہوئے مقابلے پر آئے ہو۔

[۳۹] بیچ کی یہ تفصیل چھوڑ دی گئی کہ اس پر فرعون کی صفوں میں اعتماد بحال ہو گیا اور مقابلہ شروع کرنے کا فیصلہ کر کے جادوگروں کو احکام دے دیے گئے کہ میدان میں اتر آئیں۔

[۴۰] سورۂ اعراف میں بیان ہوا تھا کہ فَلَمَّا اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ "جب انہوں نے اپنے انچھر پھینکے تو لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور انہیں دہشت زدہ کر دیا" (رکوع ۱۴)۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہ اثر صرف عام لوگوں پر ہی نہیں ہوا تھا، خود حضرت موسیٰ بھی سحر کے اثر سے متاثر ہو گئے تھے۔ اُن کی صرف آنکھوں ہی نے یہ محسوس نہیں کیا بلکہ اُن کے خیال پر بھی یہ اثر پڑا کہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔

ہاتھ میں ہے، ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگلے جاتا ہے[٤٢]۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں یہ تو جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، خواہ کسی شان سے وہ آئے۔" آخر کو یہی ہوا کہ سارے جادوگر سجدے میں گرا دیے گئے[٤٣] اور پکار اٹھے "مان لیا ہم نے ہارون اور موسیٰ کے رب کو"[٤٤]۔

---

٤١ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جونہی حضرت موسیٰ کی زبان سے "پھینکو" کا لفظ نکلا، جادوگروں نے یکبارگی اپنی لاٹھیاں اور رسیاں اُن کی طرف پھینک دیں اور اچانک اُن کو یہ نظر آیا کہ سینکڑوں سانپ دوڑتے ہوئے ان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ اس منظر سے فوری طور پر اگر حضرت موسیٰ نے ایک دہشت اپنے اندر محسوس کی ہو تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ انسان بہرحال انسان ہی ہوتا ہے۔ خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ انسانیت کے تقاضے اُس سے منفک نہیں ہو سکتے۔ علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ اُس وقت حضرت موسیٰ کو یہ خوف لاحق ہوا ہو کہ معجزے سے اس قدر مشابہ منظر دیکھ کر عوام ضرور فتنے میں پڑ جائیں گے۔

اِس مقام پر یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ قرآن یہاں اس امر کی تصدیق کر رہا ہے کہ عام انسانوں کی طرح پیغمبر بھی جادو سے متأثر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ جادوگر اس کی نبوت سلب کر لینے، یا اس کے اوپر نازل ہونے والی وحی میں خلل ڈال دینے، یا جادو کے اثر سے اُس کو گمراہ کر دینے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن فی الجملہ کچھ دیر کے لیے اُس کے قویٰ پر ایک گونہ اثر ضرور ڈال سکتا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی کھل جاتی ہے جو احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کی روایات پڑھ کر نہ صرف ان روایات کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تمام حدیثوں کو ناقابلِ اعتبار ٹھیراتے لگتے ہیں۔

٤٢ ہو سکتا ہے کہ معجزے سے جو اژدہا پیدا ہوا تھا وہ اُن تمام لاٹھیوں اور رسیوں ہی کو نگل گیا ہو جو سانپ بنی نظر آ رہی تھیں لیکن جن الفاظ میں یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں اس واقعے کو بیان کیا گیا ہے اُن سے بظاہر گمان یہی ہوتا ہے کہ اس نے لاٹھیوں اور رسیوں کو نہیں نگلا بلکہ اُس جادو کے اثر کو باطل کر دیا جس کی بدولت وہ سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔ سورۂ اعراف اور شعراء میں الفاظ یہ ہیں تَلْقَفُ مَا یَأْفِکُوْنَ: "جو جھوٹ وہ بنا رہے تھے اس کو وہ نگلے جا رہا تھا" اور یہاں الفاظ یہ ہیں کہ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا، "وہ نگل جائے گا اُس چیز کو جو انہوں نے بنا رکھی ہے"۔ اب بظاہر ہے کہ ان کا جھوٹ اور ان کی بناوٹ لاٹھیاں اور رسیاں نہ تھیں بلکہ وہ جادو تھا جس کی بدولت وہ سانپ

فرعون نے کہا "تم ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا؟ معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا

بنی نظر آرہی تھیں۔ اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ جدھر جدھر وہ گیا لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل کر اس طرح پیچھے پھینکتا چلا گیا کہ ہر لاٹھی، لاٹھی اور ہر رسی، رسی بن کر پڑی رہ گئی۔

۴۳ یعنی جب انہوں نے عصائے موسیٰ کا کارنامہ دیکھا تو انہیں فوراً یقین آگیا کہ یہ یقیناً معجزہ ہے، اُن کے فن کی چیز ہرگز نہیں ہے، اس لیے وہ اس طرح یک بارگی اور بے ساختہ سجدے میں گرے جیسے کسی نے اٹھا اٹھا کر اُن کو گرا دیا ہو۔

۴۴ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں سب کو معلوم تھا کہ یہ مقابلہ کس بنیاد پر ہو رہا ہے۔ پورے مجمع میں کوئی بھی اس غلط فہمی میں نہ تھا کہ مقابلہ موسیٰ اور جادوگروں کے کرتب کا ہو رہا ہے اور فیصلہ اس بات کا ہونا ہے کہ کس کا کرتب زبردست ہے۔ سب یہ جانتے تھے کہ ایک طرف موسیٰ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ، خالقِ زمین و آسمان کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، اور اپنی پیغمبری کے ثبوت میں یہ دعوےٰ کر رہے ہیں کہ ان کا عصا معجزے کے طور پر فی الواقع اژدہا بن جاتا ہے۔ اور دوسری طرف جادوگروں کو برسرِ عام بلا کر فرعون یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عصا سے اژدہا بن جانا معجزہ نہیں ہے بلکہ محض جادو کا کرتب ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہاں فرعون اور جادوگر اور سارے تماشائی عوام و خواص معجزے اور جادو کے فرق سے واقف تھے، اور امتحان اس بات کا ہو رہا تھا کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ جادو کی قسم سے ہے یا اُس معجزے کی قسم سے جو رب العالمین کی قدرت کے کرشمے کے سوا اور کسی طاقت سے نہیں دکھایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جادوگروں نے اپنے جادو کو مغلوب ہوتے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ "ہم نے مان لیا، موسیٰ ہم سے زیادہ باکمال ہے"، بلکہ انہیں فوراً یقین آگیا کہ موسیٰ واقعی رب العالمین کے سچے پیغمبر ہیں اور وہ پکار اُٹھے کہ ہم اُس خدا کو مان گئے جس کے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰ اور ہارون آئے ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجمع عام پر اس شکست کے کیا اثرات پڑے ہوں گے۔ اور پھر پورے ملک پر اس کا کتنا زبردست اثر ہوا ہوگا۔ فرعون نے ملک کے سب سے بڑے مرکزی میلے میں یہ مقابلہ اس امید پر کرایا تھا کہ جب مصر کے ہر گوشے سے آئے ہوئے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ جائیں گے کہ لاٹھی سے سانپ بنا دینا موسیٰ کا کوئی نرالا کمال نہیں ہے، ہر جادوگر یہ کرتب دکھا لیتا ہے، تو موسیٰ کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ لیکن اس کی یہ تدبیر اُسی پر اُلٹی پڑی، اور

گروہ ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی۔[۴۵] اچھا، اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں[۴۶] اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دیتا ہوں[۴۷]، پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے[۴۸]۔

قریہ قریہ سے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے خود جادوگروں ہی نے بالاتفاق اس بات کی تصدیق کر دی کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ اُن کے فن کی چیز نہیں ہے، یہ فی الواقع معجزہ ہے جو صرف خدا کا پیغمبر ہی دکھا سکتا ہے۔

۴۵ سورۂ اعراف میں الفاظ یہ ہیں اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا، "یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے دارالسلطنت میں ملی بھگت کر کے کی ہے تاکہ سلطنت سے اُس کے مالکوں کو بے دخل کر دو۔" یہاں اس قول کی مزید تفصیل یہ دی گئی ہے کہ تمہارے درمیان صرف ملی بھگت ہی نہیں ہے، بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ تمہارا سردار اور گرو ہے، تم نے معجزے سے شکست نہیں کھائی، بلکہ اپنے استاد سے جادو میں شکست کھائی ہے، اور تم آپس میں یہ طے کر کے آئے ہو کہ اپنے استاد کا غلبہ ثابت کر کے، اور اُسے اُس کی پیغمبری کا ثبوت بنا کر یہاں سیاسی انقلاب برپا کر دو۔

۴۶ یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں۔

۴۷ صلیب یا سولی دینے کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ ایک لمبا شہتیر سا لے کر زمین میں گاڑ دیتے تھے، یا کسی پرانے درخت کا تنا اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے، اور اُس کے اوپر کے سرے پر ایک تختہ آڑا کر کے باندھ دیتے تھے۔ پھر مجرم کو اوپر چڑھا کر اس کے دونوں ہاتھ پھیلا کر آڑے تختے کے ساتھ کیلیں ٹھونک دیتے تھے۔ اس طرح مجرم تختے کے بل لٹکا رہ جاتا تھا اور گھنٹوں سسک سسک کر جان دے دیتا تھا۔ صلیب دیے ہوئے یہ مجرم ایک مدت تک یونہی لٹکے رہنے دیے جاتے تھے تاکہ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر سبق حاصل کریں۔

۴۸ یہ ہری ہوئی بازی جیت لینے کے لیے فرعون کا آخری داؤں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جادوگروں کو انتہائی خوفناک سزا سے ڈرا کر ان سے یہ اقبال کرا لے کہ واقعی یہ اُن کی اور موسیٰ علیہ السلام کی ملی بھگت تھی اور وہ ان سے مل کر سلطنت کے خلاف سازش کر چکے تھے۔ مگر جادوگروں کے عزم و استقامت نے اُس کا یہ داؤں بھی اُلٹ دیا۔ انہوں نے اتنی ہولناک سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہو کر دنیا بھر کو یہ یقین دلا دیا کہ سازش کا الزام محض گھڑی ہوئی بات بنانے کے لیے

جادوگروں نے جواب دیا "قسم ہے اُس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں۔[۴۹] تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اِسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے، تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے۔ اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے"۔[۵۰] حقیقت یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا اُس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ جیے گا نہ مرے گا۔[۵۱] اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا، جس نے نیک عمل کیے ہوں گے، ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں، سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اُس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔ؑ

ہم[۵۲] نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور اُن کے لیے سمندر میں سے سوکھی سڑک بنا لے،[۵۳] تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے)

ایک بے شرمانہ سیاسی چال کے طور پر گھڑا گیا ہے، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ سچے دل سے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لائے ہیں۔

[۴۹] دوسرا ترجمہ اِس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے: "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم اُن روشن نشانیوں کے مقابلے میں جو ہمارے سامنے آچکی ہیں، اور اُس ذات کے مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تجھے ترجیح دیں"۔

[۵۰] یہ جادوگروں کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا اضافہ ہے۔ انداز کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ عبارت جادوگروں کے قول کا حصہ نہیں ہے۔

[۵۱] یعنی موت اور زندگی کے درمیان لٹکتا رہے گا۔ نہ موت آئے گی کہ اس کی تکلیف اور مصیبت کا خاتمہ کر دے اور نہ جینے کا ہی کوئی لطف اسے حاصل ہوگا کہ زندگی کو موت پر ترجیح دے سکے۔ زندگی سے بیزار ہوگا، مگر موت نصیب نہ ہوگی۔ مرنا چاہے گا مگر مر نہ سکے گا۔ قرآن مجید میں دوزخ کے عذابوں کی جتنی تفصیلات دی گئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ خوفناک صورت عذاب یہی ہے جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

[۵۲] بیچ میں اُن حالات کی تفصیل چھوڑ دی گئی ہے جو اس کے بعد مصر کے طویل زمانۂ قیام میں پیش آئے۔ ان تفصیلات

ڈر لگے۔

پیچھے سے فرعون اپنا لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ فرعون

کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ اعراف رکوع ۱۵-۱۶، سورۂ یونس رکوع ۹ ۔ سورۂ مومن رکوع ۳ تا ۵۔ اور سورۂ زخرف رکوع ۵۔

۵۳ـ اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام اسرائیلی و غیر اسرائیلی مسلمانوں کو (جن کے لیے "میرے بندوں" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے) مصر کے ہر حصے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں نہر سویز موجود نہ تھی۔ بحرِ احمر سے بحرِ روم (میڈیٹرینین) تک کا پورا علاقہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے بخیریت نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ نے بحرِ احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن اُدھر سے فرعون ایک لشکرِ عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اس موقع پر آ پہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورۂ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کا قافلہ لشکرِ فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ "اپنا عصا سمندر پر مار"۔ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ "فوراً سمندر پھٹ گیا اور اُس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا"۔ اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا، بلکہ بیچ کا یہ حصہ، اوپر کی آیت کے مطابق، خشک ہو کر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔ یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے اور اس سے اُن لوگوں کے بیان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر ہٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ہٹتا ہے وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا۔ اور بیچ کا حصہ سوکھ کر سڑک کی طرح نہیں بن جاتا۔

۵۴ـ سورۂ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کے گزرتے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اِس درمیانی راستے میں اُتر آیا (رکوع ۴)۔ یہاں بیان کیا گیا ہے کہ سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سمندر کے دوسرے کنارے پر سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے (رکوع ۶)۔ اور سورۂ یونس میں بتایا گیا ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون پکار اٹھا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیۤ

نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی ۵۵؎

"اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" "میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے اُس خدا کے سوا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں"۔ مگر اس آخری لمحہ کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا "آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ، فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً" "اب ایمان لاتا ہے؟ اور پہلے یہ حال تھا کہ نافرمانی کرتا رہا اور فساد کیے چلا گیا۔ اچھا، آج ہم تیری لاش کو بچائے لیتے ہیں تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا رہے"۔ (رکوع ۹)

۵۵؎ بڑے لطیف انداز میں کفارِ مکہ کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے سردار اور لیڈر بھی تم کو اسی راستے پر لیے جا رہے ہیں جس پر فرعون اپنی قوم کو لے جا رہا تھا۔ اب تم خود دیکھ لو کہ یہ کوئی صحیح رہنمائی تو نہ تھی۔

اس قصے کے خاتمے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائیبل کے بیانات کا بھی جائزہ لے لیا جائے تاکہ اُن لوگوں کے جھوٹ کی حقیقت کھل جائے جو کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔ بائبل کی کتاب خروج (EXODUS) میں اس قصے کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان کے حسب ذیل اجزا قابل توجہ ہیں:-

(۱) باب ۴، آیت ۲-۵ میں بتایا گیا ہے کہ عصا کا معجزہ حضرت موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ اور آیت ۱۷ میں انہی کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "تو اس لاٹھی کو اپنے ہاتھ میں لیے جا اور اسی سے ان معجزوں کو دکھانا"۔ مگر آگے جا کر نہ معلوم یہ لاٹھی کس طرح حضرت ہارون کے قبضے میں چلی گئی اور وہی اس سے معجزے دکھانے لگے۔ باب ۷ سے لے کر بعد کے ابواب میں مسلسل ہم کو حضرت ہارون ہی لاٹھی کے معجزے دکھاتے نظر آتے ہیں۔

(۲) باب ۵ میں فرعون سے حضرت موسیٰ کی پہلی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے، اور اس میں سرے سے اُس بحث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ربوبیت کے مسئلے پر اُن کے اور فرعون کے درمیان ہوئی تھی۔ فرعون کہتا ہے کہ "خداوند کون ہے کہ میں اُس کی بات مانوں اور بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا"۔ مگر حضرت موسیٰ اور ہارون اس کے سوا کچھ جواب نہیں دیتے کہ "عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے" (باب ۵۔ آیت ۲ و ۳)

(۳) جادوگروں سے مقابلے کی پوری داستان بس ان چند فقروں میں سمیٹ دی گئی ہے:-

"اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ جب فرعون تم کو کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ تو ہارون سے کہنا

کہ اپنی لاٹھی کو لیکر فرعون کے سامنے ڈال دے تاکہ وہ سانپ بن جائے۔ اور موسیٰ اور ہارون فرعون کے پاس گئے اور انہوں نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے ڈال دی اور وہ سانپ بن گئی۔ تب فرعون نے بھی دانائوں اور جادوگروں کو بلوایا اور مصر کے جادوگروں نے بھی اپنے جادو سے ایسا ہی کیا۔ کیونکہ انہوں نے بھی اپنی اپنی لاٹھی سامنے ڈالی اور وہ سانپ بن گئیں۔ لیکن ہارون کی لاٹھی ان کی لاٹھیوں کو نگل گئی۔" (باب ۷۔ آیت ۸۔۱۲)

اس بیان کا مقابلہ قرآن کے بیان سے کرکے دیکھ لیا جائے کہ قصے کی ساری روح یہاں کس بری طرح فنا کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جشن کے دن کھلے میدان میں باقاعدہ چیلنج کے بعد مقابلہ ہونا اور پھر شکست کے بعد جادوگروں کا ایمان لانا، جو قصے کی اصل جان تھا، سرے سے یہاں مذکور ہی نہیں ہے۔

(۴) قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا مطالبہ بنی اسرائیل کی رہائی اور آزادی کا تھا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ مطالبہ صرف یہ تھا "ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزل بیابان میں جاکر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں" (باب ۳ آیت ۱۸)

(۵) مصر سے نکلنے اور فرعون کے غرق ہونے کا مفصل حال باب ۱۱ سے ۱۴ تک بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سی مفید معلومات، اور قرآن کے اجمال کی تفصیلات بھی ہمیں ملتی ہیں اور ان کے ساتھ متعدد عجیب باتیں بھی۔ مثلاً باب ۱۴ کی آیات ۱۵۔۱۶ میں حضرت موسیٰ کو حکم دیا جاتا ہے کہ "تو اپنی لاٹھی (جی ہاں، اب لاٹھی حضرت ہارون سے لیکر پھر حضرت موسیٰ کو دے دی گئی ہے) اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے" لیکن آگے چل کر آیت ۲۱۔۲۲ میں کہا جاتا ہے کہ "پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا" یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آیا یہ معجزہ تھا یا طبعی واقعہ؟ اگر معجزہ تھا تو عصا کی ضرب سے ہی رونما ہو گیا ہو گا، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے۔ اور اگر طبعی واقعہ تھا تو یہ عجیب صورت ہے کہ مشرقی آندھی نے سمندر کو بیچ میں سے پھاڑ کر پانی کو دونوں طرف دیوار کی طرح کھڑا کر دیا اور بیچ میں سے

اے بنی اسرائیل، ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی، اور طور کے دائیں جانب تمہاری حاضری[۵۶] کے لیے وقت مقرر کیا،[۵۷] اور تم پر من و سلویٰ اتارا[۵۸][۵۹] ـــــ کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور اسے کھا کر

خشک راستہ بنا دیا گیا فطری طریقے سے ہوا کبھی ایسے کرشمے دکھاتی ہے؟

تلمود کا بیان نسبتاً بائبل سے مختلف اور قرآن سے قریب تر ہے، مگر دونوں کا مقابلہ کرنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ ایک جگہ براہ راست علم وحی کی بنا پر واقعات بیان کیے جا رہے ہیں، اور دوسری جگہ صدیوں کی سینہ بسینہ روایات میں واقعات کی صورت اچھی خاصی مسخ ہو گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: THE TALMUD SELECTIONS:- H. POLANO, PP. 150-54.

۵۶ سمندر کو عبور کرنے سے لیکر کوہ سینا کے دامن میں پہنچنے تک کی داستان بیچ میں چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات سورۂ اعراف رکوع ۱۶-۱۷ میں گزر چکی ہیں۔ اور وہاں یہ بھی گزر چکا ہے کہ مصر سے نکلتے ہی بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے ایک مندر کو دیکھ کر اپنے لیے ایک بناوٹی خدا مانگ بیٹھے تھے۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۷۵)۔

۵۷ یعنی طور کے مشرقی دامن میں۔

۵۸ سورۂ بقرہ رکوع ۶، اور سورۂ اعراف رکوع ۱۷ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت کا ہدایت نامہ عطا کرنے کے لیے چالیس دن کی میعاد مقرر کی تھی جس کے بعد حضرت موسیٰ کو پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا کیے گئے۔

۵۹ من و سلویٰ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۷۷، اور جلد دوم صفحہ ۸۰۔ بائبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشت سین میں ایلیم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آگئی تھی، اس وقت من و سلویٰ کا نزول شروع ہوا، اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا (خروج۔ باب ۱۶۔ گنتی باب ۱۱، آیت ۷-۹۔ یشوع۔ باب ۵، آیت ۱۲) کتاب خروج میں من و سلویٰ کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:-

"اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔ اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی

سرکشی نہ کرو، ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا، اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہا۔ البتہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلتا رہے، اس کے لیے میں بہت درگذر کرنے والا ہوں[61]۔

[62] اور کیا چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰ[63]؟"

اُس نے عرض کیا "وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں۔ میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں اے میرے رب، تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے۔"

گول گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اُسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے مَنّ؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے" (باب ۱۶۔ آیت ۱۳-۱۵)

"اور بنی اسرائیل نے اُس کا نام مَنّ رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اُس کا مزہ شہد کے بنے ہوئے پوئے کی طرح تھا" (آیت ۳۱)

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے:-

"لوگ اِدھر اُدھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چکی میں پیستے یا اوکھلی میں کوٹ لیتے تھے۔ پھر اسے ہانڈیوں میں اُبال کر روٹیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر گاہ میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ مَن بھی گرتا تھا" (باب ۱۱۔ آیت ۸-۹)

یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ کیونکہ ۴۰ برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں بٹیروں کی وہ کثرت ہے، نہ مَن ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ تلاش و جستجو کرنے والوں نے اُن علاقوں کو چھان مارا ہے جہاں بائیبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے ۴۰ سال تک دشت نوردی کی تھی۔ مَن اُن کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بے وقوف بنانے کے لیے مَن کا حلوا ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔

[61] یعنی مغفرت کے لیے چار شرطیں ہیں۔ اول، توبہ۔ یعنی سرکشی و نافرمانی یا شرک و کفر سے باز آ جانا۔ دوسرے ایمان یعنی اللہ اور رسول اور کتاب اور آخرت کو صدقِ دل سے مان لینا۔ تیسرے، عمل صالح یعنی اللہ اور رسول کی ہدایات کے مطابق نیک عمل کرنا۔ چوتھے اِہتداء، یعنی راہ راست پر ثابت قدم رہنا اور پھر غلط راستے پر نہ جا پڑنا۔

فرمایا "اچھا، تو سنو، ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری ؑ نے انہیں گمراہ کر ڈالا۔"

؁ یہاں سے سلسلۂ بیان اُس واقعہ کے ساتھ جڑتا ہے جو ابھی اوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ تم طور کے دائیں جانب ٹھیرو، او رچالیس دن کی مدت گزرنے پر تمہیں ہدایت نامہ عطا کیا جائیگا۔
؁ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو راستے ہی میں چھوڑ کر حضرت موسیٰ اپنے رب کی ملاقات کے شوق میں آگے چلے گئے تھے۔ طور کی جانب ایمن میں، جہاں کا وعدہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا، ابھی قافلہ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرت موسیٰ اکیلے روانہ ہو گئے اور حاضری دے دی۔ اُس موقع پر جو معاملات خدا اور بندے کے درمیان ہوئے ان کی تفصیلات سورۂ اعراف رکوع ۱۷ میں درج ہیں۔ حضرت موسیٰ کا دیدار الٰہی کی استدعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، پھر اللہ کا ایک پہاڑ پر ذرا سی تجلی فرما کر اسے ریزہ ریزہ کر دینا اور حضرت موسیٰ کا بیہوش ہو کر گر پڑنا، اس کے بعد پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا ہونا، یہ سب اسی وقت کے واقعات ہیں۔ یہاں ان واقعات کا صرف وہ حصہ بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل کی گو سالہ پرستی سے متعلق ہے۔ اس کے بیان سے مقصود کفارِ مکہ کو یہ بتانا ہے کہ ایک قوم میں بت پرستی کا آغاز کس طرح ہوا کرتا ہے، اور اللہ کے نبی اس فتنے کو اپنی قوم میں سر اٹھاتے دیکھ کر کیسے بے تاب ہو جایا کرتے ہیں۔
؁ یہ اس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ یائے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہرحال کوئی نہ کوئی نسبت ہی ہے، خواہ قبیلے کی طرف ہو یا نسل کی طرف یا مقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح السامری کہہ کر اس کا ذکر کر رہا ہے اُس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں سامری قبیلے یا نسل یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ اس سے زیادہ کوئی تشریح، قرآن کے اس مقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت درکار نہیں ہے۔ لیکن یہ مقام اُن اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی مشنریوں، اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی حد کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ معاذ اللہ، قرآن کے مصنف کی جہالت کا صریح ثبوت ہے، اس لیے کہ دولتِ اسرائیل کا دار السلطنت "سامریہ" اس واقعہ کے کئی صدی بعد

موسیٰ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جاکر اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے؟ ۹۲۶ کیا تمہیں دن

---

۹۲۵ - ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا۔ پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے "سامریوں" کے نام سے شہرت پائی۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ اِن سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہری بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا، اور یہودیوں کے ذریعہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بات کی سُن گُن پائی ہوگی، اس لیے انہوں نے لے جاکر اس کا تعلق حضرت موسیٰ کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہری بچھڑے کی پرستش رائج کرنے والا ایک سامری شخص تھا۔ اسی طرح کی باتیں اِن لوگوں نے ہامان کے معاملہ میں بھی بنائی ہیں جسے قرآن فرعون کے وزیر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، اور عیسائی مشنری اور مستشرقین اسے اخسویرس شاہ ایران کے درباری امیر "ہامان" سے لے جاکر ملا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا ایک اور ثبوت ہے۔ شاید ان مدعیانِ علم و تحقیق کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص یا قبیلہ یا مقام ہوا کرتا تھا اور ایک نام کے دو یا زائد اشخاص یا قبیلے و مقام ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ حالانکہ سُمیری قدیم تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی، اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ حضرت موسیٰ کے عہد میں اس قوم کے، یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔ پھر خود اُس سامریہ کی اصل کو بھی دیکھ لیجیے جس کی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ دولتِ اسرائیل کے فرمانروا عُمری نے ایک شخص "سمر" نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دار السلطنت تعمیر کیا۔ اور چونکہ پہاڑ کے سابق مالک کا نام سمر تھا اس لیے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا۔ (سلاطین ۱، باب ۱۶۔ آیت ۲۴)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے "سمر" نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پاکر ان کی نسل یا قبیلے کا نام سامری، اور مقامات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔

۹۲۶ - "اچھا وعدہ نہیں کیا تھا" بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ متن میں جو ترجمہ ہم نے اختیار کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک تمہارے رب نے تمہارے ساتھ جتنی بھلائیوں کا وعدہ بھی کیا ہے وہ سب تمہیں حاصل ہوتی رہی ہیں۔ تمہیں مصر سے

لگ گئے ہیں٦٥ یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟"٦٦

انہوں نے جواب دیا "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا"٦٧ ———

بخیریت نکالا، غلامی سے نجات دی، تمہارے دشمن کو تہس نہس کیا، تمہارے لیے ان صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں سائے اور خوراک کا بندوبست کیا۔ کیا یہ سارے اچھے وعدے پورے نہیں ہوئے؟ دوسرے ترجمے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں شریعت اور ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، کیا تمہارے نزدیک وہ کسی خیر اور بھلائی کا وعدہ نہ تھا؟

٦٥ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کیا وعدہ پورا ہونے میں بہت دیر لگ گئی کہ تم بے صبر ہو گئے؟" پہلے ترجمے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر اللہ تعالیٰ ابھی ابھی جو عظیم الشان احسانات کر چکا ہے، کیا اُن کو کچھ بہت زیادہ مدت گزر گئی ہے کہ تم انہیں بھول گئے؟ کیا تمہاری مصیبت کا زمانہ بیتے قرنیں گزر چکی ہیں کہ تم سرمست ہو کر بھٹکنے لگے؟ دوسرے ترجمے کا مطلب صاف ہے کہ ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا اُس کے وفا ہونے میں کوئی تاخیر تو نہیں ہوئی ہے جس کو تم اپنے لیے عذر اور بہانہ بنا سکو۔

٦٦ اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ہر قوم اپنے نبی سے کرتی ہے۔ اُس کے اتباع کا وعدہ۔ اس کی دی ہوئی ہدایت پر ثابت قدم رہنے کا وعدہ۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنے کا وعدہ۔

٦٧ یہ اُن لوگوں کا عذر تھا جو سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم نے تو زیورات پھینک دیے تھے، نہ ہماری نیت کوئی بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

"ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لد گئے تھے"، اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصری رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرانوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ لیکن بائیبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگ کر لے لیے تھے اور اس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لوٹ کر راتوں رات "ہجرت" کے لیے چل کھڑا ہوا تھا۔ یہ اخلاقی کارنامہ صرف اسی حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطور خود اسے انجام دیا ہو،

۶۷ پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں سے

بلکہ یہ کارِ خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰ نے ان کو سکھایا تھا، اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے کی تھی۔ بائیبل کی کتاب خروج میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"خدا نے موسیٰ سے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور اُن کو کہہ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کی ہمسائی سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے"۔ باب ۳ آیت ۱۴ تا ۲۲

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا ۔ ۔ ۔ سو اب تو لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیور لے، اور خداوند نے اُن لوگوں پر مصریوں کو مہربان کر دیا" (باب ۱۱-آیت ۲-۳)

"اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لیے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انہوں نے مانگا، انہوں نے دیا۔ سو انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا" (باب ۱۲- آیت ۳۵-۳۶)

افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی اِس روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا ہے اور ان کی اس غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیورات کا یہ بوجھ اسی لوٹ کا بوجھ تھا۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے "اور ہم نے بس اُن کو پھینک دیا تھا" کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب اپنے زیورات کو لادے پھرنے سے لوگ تنگ آ گئے ہوں گے تو باہم مشورے سے یہ بات قرار پائی ہو گی کہ سب کے زیورات ایک جگہ جمع کر لیے جائیں، اور یہ نوٹ کر لیا جائے کہ کس کا کتنا سونا اور کس کی کتنی چاندی ہے، پھر ان کو گلا کر اینٹوں اور سلاخوں کی شکل میں ڈھال لیا جائے، تاکہ قوم کے مجموعی سامان کے ساتھ گدھوں اور بیلوں پر ان کو لاد کر چلا جا سکے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق ہر شخص اپنے زیورات لا لا کر ڈھیر میں پھینکتا چلا گیا ہو گا۔

۶۸ یہاں سے پیراگراف کے آخر تک کی عبارت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ قوم کا جواب "ہم پھینک دیا تھا" پر ختم ہو گیا ہے اور بعد کی یہ تفصیل اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے۔ اس سے صورتِ واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ

بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اُٹھے "یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا۔ موسیٰ اِسے بھول گیا"۔ کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟
ہارون (موسیٰ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ "لوگو، تم اِس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو، تمہارا رب تو رحمٰن ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو"۔ مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ "ہم تو اس کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آجائے"[۶۹]۔

پیش آنے والے فتنے سے بے خبر، اپنے اپنے زیور لا لا کر ڈھیر کرتے چلے گئے۔ اور سامری صاحب بھی ان میں شامل تھے بعد میں زیور گلانے کی خدمت سامری صاحب نے اپنے ذمے لے لی، اور کچھ ایسی چال چلی کہ سونے کی اینٹیں یا سلاخیں بنانے کے بجائے ایک بچھڑے کی مورت بھٹی سے برآمد ہوئی جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ اس طرح سامری نے قوم کو دھوکا دیا کہ میں تو صرف سونا گلانے کا قصوروار ہوں، یہ تمہارا خدا آپ ہی اس شکل میں جلوہ فرما ہو گیا ہے۔

۶۹۔ بائبل اس کے برعکس حضرت ہارون پر الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے اور اسے معبود قرار دینے کا گناہِ عظیم انہی سے سرزد ہوا تھا:۔

"اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اُس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو، جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا۔ ہارون نے اُن سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ سب لوگ اُن کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ہارون کے پاس لے آئے۔ اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل یہی تیرا دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہوگی"۔ (خروج، باب ۳۲ - آیت ۱-۵)

بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ غلط روایت اس وجہ سے مشہور ہوئی ہو کہ سامری کا نام بھی ہارون ہی ہو اور بعد کے لوگوں نے اس ہارون کو ہارون نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنری

موسیٰ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارون کی طرف پلٹا اور) بولا" ہارون، تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟ [۵۰]

اور مغربی مستشرقوں کو اصرار ہے کہ قرآن یہاں بھی ضرور غلطی پر ہے۔ بچھڑے کو خدا اُن کے مقدس نبی نے ہی بنایا تھا اور اُن کے دامن سے اس داغ کو صاف کر کے قرآن نے ایک احسان نہیں بلکہ اُلٹا قصور کیا ہے۔ یہ ہے اِن لوگوں کی ہٹ دھرمی کا حال۔ اور ان کو نظر نہیں آتا کہ اسی باب میں چند سطر آگے چل کر خود بائیبل اپنی غلط بیانی کا راز کس طرح فاش کر رہی ہے۔ اِس باب کی آخری دس آیتوں میں بائیبل یہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کے بعد بنی لاوی کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہِ عظیم کیا ہے انہیں قتل کیا جائے، اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اُس بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گوسالہ پرستی کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ اُس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ہارون کیوں چھوڑ دیے گئے؟ اگر وہی اِس جرم کے بانی مبانی تھے، تو انہیں اِس قتلِ عام سے کس طرح معاف کیا جا سکتا تھا؟ کیا بنی لاوی یہ نہ کہتے کہ موسیٰ، ہم کو تو حکم دیتے ہو کہ ہم اپنے گناہ گار بھائیوں اور ساتھیوں اور پڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے حالانکہ اصل گناہ گار وہی تھا؟ آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ نے خداوند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے، ورنہ میرا نام اپنی کتاب میں سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ "جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اُسی کا نام اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا"۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہارون کا نام نہ مٹایا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس اُن کو اور ان کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب، یعنی بنی لاوی کی سرداری اور مَقدِس کی کہانت سے سرفراز کیا گیا۔ (گنتی، باب ۱۸۔ آیت ۱-۷) کیا بائیبل کی یہ اندرونی شہادت خود اُس کے اپنے سابق بیان کی تردید اور قرآن کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہی ہے؟

۵۰؎ حکم سے مراد وہ حکم ہے جو پہاڑ پر جاتے وقت، اور اپنی جگہ حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی سرداری سونپتے وقت حضرت موسیٰ نے دیا تھا۔ سورۂ اعراف میں اسے اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ "اور موسیٰ نے (جاتے ہوئے) اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میری جانشینی کرو اور دیکھو، اصلاح کرنا، مفسدوں کے طریقے کی پیروی نہ کرنا"۔ (رکوع ۱۷)

ہارون نے جواب دیا "اے میری ماں کے بیٹے، میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ،[۶۸] مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہیگا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا"[۶۹]

موسیٰ نے کہا "اور سامری، تیرا کیا معاملہ ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں نے وہ چیز دیکھی جو اِن لوگوں کو نظر نہ آئی، پس میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اٹھالی اور اُس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سمجھایا"[۷۰]

---

[۶۸] سورۂ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے پتھر کی وہ تختیاں، جو پیشی خداوندی سے لائے تھے، پھینک دیں اور بھائی کے سر کے بال پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچا (رکوع ۱۸)۔

[۶۹] دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "میرے حکم کا انتظار نہ کیا" سورۂ اعراف میں حضرت ہارون کے جواب کی مزید تفصیل یہ دی گئی ہے کہ قوم نے مجھے کمزور سمجھ کر دبا لیا اور قریب تھا کہ یہ لوگ مجھے مار ڈالتے۔ اس مقام کے ترجمے میں ہم نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ حضرت موسیٰ چھوٹے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے بڑے تھے، اور حضرت ہارون بڑے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے چھوٹے تھے

[۷۰] اس آیت کی تفسیر میں دو گروہوں کی طرف سے عجیب کھینچ تان کی گئی ہے۔

ایک گروہ، جس میں قدیم مفسرین اور قدیم طرز کے مفسرین کی بڑی اکثریت شامل ہے، اس کا یہ مطلب بیان کرتا ہے کہ "سامری نے رسول، یعنی حضرت جبریل کو گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اور اُن کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی بھر مٹی اٹھالی تھی، اور یہ اسی مٹی کی کرامت تھی کہ جب اسے بچھڑے کے بت پر ڈالا گیا تو اس میں زندگی پیدا ہو گئی اور جیتے جاگتے بچھڑے کی سی آواز نکلنے لگی" حالانکہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ فی الواقع ایسا ہوا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کی باز پرس کے جواب میں سامری نے یہ بات بنائی۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مفسرین اس کو ایک امرِ واقعی، اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت کیسے سمجھ بیٹھے۔

دوسرا گروہ سامری کے قول کو ایک اور ہی معنی پہناتا ہے۔ اس کی تاویل کے مطابق سامری نے دراصل یہ کہا تھا کہ "مجھے رسول، یعنی حضرت موسیٰ میں، یا اُن کے دین میں وہ کمزوری نظر آئی جو دوسروں کو نظر نہ آئی۔ اس لیے میں نے ایک حد تک تو اُس کے نقشِ قدم کی پیروی کی، مگر بعد میں اسے چھوڑ دیا" یہ تاویل غالباً سب سے پہلے ابو مسلم اصفہانی کو سوجھی تھی، پھر امام

رازی نے اس کو اپنی تفسیر میں نقل کر کے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور اب نئے طرز کے مفسرین بالعموم اسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ لیکن یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ قرآن معموں اور پہیلیوں کی زبان میں نازل نہیں ہوا ہے بلکہ صاف اور عام فہم عربی مبین میں نازل ہوا ہے جس کو ایک عام عرب اپنی زبان کے معروف محاورے کے مطابق سمجھ سکے۔ کوئی شخص جو عربی زبان کے معروف محاورے اور روزمرہ سے واقف ہو، کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ سامری کے اِس مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے عربی مبین میں وہ الفاظ استعمال کیے جائیں گے جو آیت زیر تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔ نہ ایک عام عرب ان الفاظ کو سن کر کبھی وہ مطلب لے سکتا ہے جو یہ حضرات بیان کر رہے ہیں۔ لغت کی کتابوں میں سے کسی لفظ کے وہ مختلف مفہومات تلاش کر لینا جو مختلف محاوروں میں اس سے مراد لیے جاتے ہوں، اور ان میں سے کسی مفہوم کو لا کر ایک ایسی عبارت میں چسپاں کر دینا جہاں ایک عرب اس لفظ کو ہرگز اس مفہوم میں استعمال نہ کرے گا، زبان دانی تو نہیں ہو سکتا، البتہ سخن سازی کا کرتب ضرور مانا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے کرتب فرہنگ آصفیہ ہاتھ میں لے کر اگر کوئی شخص خود ان حضرات کی اردو تحریروں میں، یا آکسفورڈ ڈکشنری لے کر ان کی انگریزی تحریروں میں، دکھانے شروع کر دے، تو شاید اپنے کلام کی دو چار ہی تاویلیں سن کر یہ حضرات چیخ اٹھیں۔ بالعموم قرآن میں ایسی تاویلیں اس وقت کی جاتی ہیں جبکہ ایک شخص کسی آیت کے صاف اور سیدھے مطلب کو دیکھ کر اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ یہاں تو اللہ میاں سے بڑی بے احتیاطی ہو گئی، لاؤ میں ان کی بات اس طرح بنا دوں کہ ان کی غلطی کا پردہ ڈھک جائے اور لوگوں کو ان پر ہنسنے کا موقع نہ ملے۔

اِس طرزِ فکر کو چھوڑ کر جو شخص بھی اس سلسلۂ کلام میں اس آیت کو پڑھے گا وہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لے گا کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا جس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک زبردست مکر و فریب کی اسکیم تیار کی تھی۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی اور ساری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ بلکہ اس پر مزید یہ جسارت بھی کی کہ خود حضرت موسیٰ کے سامنے ایک پُر فریب داستان گھڑ کر رکھ دی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا، اور ساتھ ہی یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبریلؑ ہی ہوں، جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ اس نے رسول کا لفظ حضرت موسیٰ کے لیے استعمال کیا تھا، تو یہ اس کی ایک اور مکاری تھی۔ وہ اس طرح حضرت موسیٰ کو فریبی رشوت دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے اپنے نقشِ قدم کی برکت کا کرشمہ سمجھ کر پھول جائیں،

موسیٰ نے کہا " اچھا تو جا، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا [۷۲]۔ اور تیرے لیے بازپرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھ اپنے اِس خدا کو جس پر تو ریجھا ہوا تھا، اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔ لوگو، تمہارا خدا تو بس ایک اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے، ہر چیز پر اُس کا علم حاوی ہے۔"

اور اپنی مزید کرامتوں کا اشتہار دینے کے لیے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ قرآن اس سارے معاملے کو سامری کے فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اپنی طرف سے بطور واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قباحت لازم آتی ہو اور لغت کی کتابوں سے مدد لے کر خواہ مخواہ کی سخن سازی کرنی پڑے۔ بلکہ بعد کے فقرے میں حضرت موسیٰ نے جس طرح اس کو پھٹکارا ہے اور اس کے لیے سزا تجویز کی ہے اُس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اُس کے گھڑے ہوئے اس پُر فریب افسانے کو سنتے ہی اس کے منہ پر مار دیا گیا۔

[۷۲] یعنی صرف یہی نہیں کہ زندگی بھر کے لیے معاشرے سے اس کے تعلقات توڑ دیے گئے اور اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا، بلکہ یہ ذمہ داری بھی اسی پر ڈالی گئی کہ ہر شخص کو وہ خود اپنے اچھوت پن سے آگاہ کرے اور دور ہی سے لوگوں کو مطلع کرتا رہے کہ مَیں اچھوت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ بائیبل کی کتاب احبار میں کوڑھیوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے ہیں اُن میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ:

> " اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اُس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہے، اُس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہو" (باب ۱۳۔ آیت ۴۵ - ۴۶)

اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے طور پر اس کو کوڑھ کے مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہو گا، یا پھر اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہو گی کہ جس طرح جسمانی کوڑھ کا مریض لوگوں سے الگ کر دیا جاتا ہے اُسی طرح اِس اخلاقی کوڑھ کے مریض کو بھی الگ کر دیا جائے، اور یہ بھی کوڑھی کی طرح پکار پکار کر ہر قریب آنے والے کو مطلع کرتا رہے کہ مَیں ناپاک ہوں، مجھے نہ چھونا۔

اے محمدؐ[۷۵]، اس طرح ہم پچھلے گزرے ہوئے حالات کی خبریں تم کو سناتے ہیں، اور ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو ایک "ذِکر" (درسِ نصیحت) عطا کیا ہے[۷۶]۔ جو کوئی اس سے منہ موڑے گا وہ قیامت کے روز سخت بارِ گناہ اُٹھائے گا، اور ایسے سب لوگ ہمیشہ اس کے وبال میں گرفتار رہیں گے، اور قیامت کے دن اُن کے لیے (اس جرم کی ذمہ داری کا بوجھ) بڑا تکلیف دہ بوجھ ہوگا[۷۷]۔ اس دن جبکہ صور پھونکا[۷۸] جائے گا

ف۷۵ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ختم کرکے اب پھر تقریر کا رُخ اُس مضمون کی طرف مڑتا ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک مرتبہ پلٹ کر سورہ کی اُن ابتدائی آیات کو پڑھ لیجیے جن کے بعد یکایک حضرت موسیٰ کا قصہ شروع ہوگیا تھا۔ اس سے آپ کی سمجھ میں اچھی طرح یہ بات آجائے گی کہ سورہ کا اصل موضوع بحث کیا ہے، بیچ میں قصۂ موسیٰ کس لیے بیان ہوا ہے، اور اب قصہ ختم کرکے کس طرح تقریر اپنے موضوع کی طرف پلٹ رہی ہے۔

ف۷۶ یعنی یہ قرآن، جس کے متعلق آغازِ سورہ میں کہا گیا تھا کہ یہ کوئی اَن ہونا کام تم سے لینے اور تم کو بیٹھے بٹھائے ایک مشقت میں مبتلا کر دینے کے لیے نازل نہیں کیا گیا ہے، یہ تو ایک یاددہانی اور نصیحت (تذکرہ) ہے ہر اُس شخص کے لیے جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو۔

ف۷۷ اس میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ جو شخص اس درسِ نصیحت، یعنی قرآن سے منہ موڑے گا اور اس کی ہدایت و رہنمائی قبول کرنے سے انکار کرے گا، وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بھیجنے والے خدا کا کچھ نہ بگاڑے گا۔ اُس کی یہ حماقت دراصل اُس کی خود اپنے ساتھ دشمنی ہوگی۔ دوسری بات یہ بتائی گئی کہ کوئی شخص، جس کو قرآن کی یہ نصیحت پہنچے اور پھر وہ اسے قبول کرنے سے پہلو تہی کرے، آخرت میں سزا پانے سے نہیں بچ سکتا۔ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ کسی قوم، کسی ملک، کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ جب تک یہ قرآن دنیا میں موجود ہے، جہاں جہاں، جس جس ملک اور قوم کے جس شخص کو بھی یہ پہنچے گا، اس کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوں گے۔ تیسرا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ یا تو اس کو مانے اور اس کی پیروی اختیار کرے۔ یا اس کو نہ مانے اور اس کی پیروی سے منہ موڑ لے۔ پہلا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام آگے آرہا ہے۔ اور دوسرا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام یہ ہے جو اس آیت میں بتا دیا گیا ہے۔

ف۷۸ صُور، یعنی نرسنگھا، قرنا، یا بوق۔ آج کل اسی چیز کا قائم مقام بگل ہے جو فوج کو جمع یا منتشر کرنے اور ہدایات دینے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے نظم کو سمجھانے کے لیے وہ الفاظ اور اصطلاحیں استعمال

اور ہم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے مارے) پتھرائی ہوئی ہونگی[۷۹]، آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ دنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن گزارے ہونگے[۸۰] ـــــــ

فرمانا ہے جو خود انسانی زندگی میں اسی سے ملتے جلتے نظم کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان الفاظ اور اصطلاحوں کے استعمال سے مقصود ہمارے تصور کو اصل چیز کے قریب لے جانا ہے، نہ یہ کہ ہم سلطنت الٰہی کے نظم کی مختلف چیزوں کو بعینہٖ ان محدود معنوں میں لے لیں، اور ان محدود صورتوں کی چیزیں سمجھ لیں جیسی کہ وہ ہماری زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم زمانے سے آج تک لوگوں کو جمع کرنے اور اہم باتوں کا اعلان کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی چیز پھونکی جاتی رہی ہے جو صور یا بگل سے ملتی جلتی ہو۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ایسی ہی ایک چیز قیامت کے روز پھونکی جائے گی جس کی نوعیت ہمارے نرسنگھے کی سی ہوگی۔ ایک دفعہ وہ پھونکی جائے گی اور سب پر موت طاری ہو جائے گی۔ دوسری دفعہ پھونکنے پر سب جی اٹھیں گے اور زمین کے ہر گوشے سے نکل نکل کر میدان حشر کی طرف دوڑنے لگیں گے۔

۷۹؎ اصل میں لفظ "زُرْقًا" استعمال ہوا ہے جو اَزرَق کی جمع ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ لوگ خود اَزرَق (سفیدی مائل نیلگوں) ہو جائیں گے کیونکہ خوف و دہشت کے مارے ان کا خون خشک ہو جائے گا اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ گویا ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں ہے۔ اور بعض دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو ازرق العین (کرنجی آنکھوں والے) کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ شدتِ ہول سے ان کے دیدے پتھرا جائیں گے۔ جب کسی شخص کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے تو اس کے حدقۂ چشم کا رنگ سفید پڑ جاتا ہے۔

۸۰؎ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "موت کے بعد سے اس وقت تک تم کو مشکل ہی سے دس دن گزرے ہونگے"۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز لوگ اپنی دنیوی زندگی کے متعلق بھی یہ اندازہ لگائیں گے کہ وہ بہت تھوڑی تھی، اور موت سے لے کر قیامت تک جو وقت گزرا ہوگا اس کے متعلق بھی ان کے اندازے کچھ ایسے ہی ہونگے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ، قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّينَ" اللہ تعالیٰ پوچھے گا تم زمین میں کتنے سال رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے ایک دن یا دن کا ایک حصہ رہے ہونگے، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیے" (المومنون۔ رکوع ۶)۔ دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَٰلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ، وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ

ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے (ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ) اُس وقت ان میں سے

والایمان لقد لبثتم فی کتاب اللہ الی یوم البعث فھذا یوم البعث ولکنکم کنتم لا تعلمون" "اور جب روز قیامت قائم ہو جائے گی تو مجرم لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم (موت کی حالت میں) ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں پڑے رہے ہیں۔ اسی طرح وہ دنیا میں بھی دھوکے کھاتے رہتے تھے۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا وہ کہیں گے کہ کتاب اللہ کی رو سے تو تم یوم البعث تک پڑے رہے ہو اور یہ وہی یوم البعث ہے، مگر تم جانتے نہ تھے" (الروم۔ رکوع ۶)۔ ان مختلف تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی اور برزخ کی زندگی، دونوں ہی کو وہ بہت قلیل سمجھیں گے۔ دنیا کی زندگی کے متعلق وہ اس لیے یہ باتیں کریں گے کہ اپنی امیدوں کے بالکل خلاف جب انہیں آخرت کی ابدی زندگی میں آنکھیں کھولنی پڑیں گی، اور جب وہ دیکھیں گے کہ یہاں کے لیے وہ کچھ بھی تیاری کرکے نہیں آئے ہیں، تو انتہائی حسرت کے ساتھ وہ اپنی دنیوی زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھیں گے اور کف افسوس ملیں گے کہ چار دن کے لطف و مسرت اور فائدہ و لذت کی خاطر ہم نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔ موت کے بعد سے قیامت تک کا وقت انہیں اس لیے تھوڑا نظر آئے گا کہ زندگی بعد موت کو وہ دنیا میں غیر ممکن سمجھتے تھے اور قرآن کے بتائے ہوئے عالم آخرت کا جغرافیہ کبھی سنجیدگی کے ساتھ ان کے ذہن میں اترا ہی نہ تھا۔ یہی تصورات لیے ہوئے دنیا میں احساس و شعور کی آخری ساعت انہوں نے ختم کی تھی۔ اب جو اچانک وہ آنکھیں ملتے ہوئے دوسری زندگی میں بیدار ہوں گے اور دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو ایک بگل یا نرسنگھے کی آواز پر مارچ کرتے پائیں گے تو وہ شدید گھبراہٹ کے ساتھ اندازہ لگائیں گے کہ فلاں ہسپتال میں بیہوش ہونے یا فلاں جہاز میں ڈوبنے یا فلاں مقام پر حادثے سے دوچار ہونے کے بعد سے اِس وقت تک آخر کتنا وقت لگا ہو گا۔ ان کی کھوپڑی میں اُس وقت یہ بات سمائے گی ہی نہیں کہ دنیا میں وہ جاں بحق ہو چکے تھے اور اب یہ وہی دوسری زندگی ہے جسے ہم بالکل لغویات کہہ کر ٹھٹھوں میں اڑا دیا کرتے تھے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک یہ سمجھے گا کہ شاید میں چند گھنٹے یا چند دن بیہوش پڑا رہا ہوں، اور اب شاید ایسے وقت مجھے ہوش آیا ہے یا ایسی جگہ اتفاق سے پہنچ گیا ہوں جہاں کسی بڑے حادثے کی وجہ سے لوگ ایک طرف کو بھاگے جا رہے ہیں۔ بعید نہیں کہ آج کل کے مرنے والے صاحب لوگ صور کی آواز کو کچھ دیر تک ہوائی حملے کا سائرن ہی سمجھتے رہیں۔

۸۱ھ یہ جملۂ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں سامعین کے اِس شبہ کو رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے کہ آخر اِس وقت

جو زیادہ سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہوگا وہ کہے گا کہ نہیں، تمہاری دنیا کی زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی ؏ ــ یہ لوگ ۸۲ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے۔ کہو کہ میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دیگا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے

میدان حشر میں بھاگتے ہوئے لوگ چپکے چپکے جو باتیں کریں گے وہ آج یہاں کیسے بیان ہو رہی ہیں۔

۸۲ یہ بھی جملۂ معترضہ ہے جو دوران تقریر میں کسی سامع کے سوال پر ارشاد ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ سورت ایک الہامی تقریر کے انداز میں سنائی جا رہی ہوگی اس وقت کسی نے مذاق اڑانے کے لیے یہ سوال اٹھایا ہوگا کہ قیامت کا جو نقشہ آپ کھینچ رہے ہیں اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے لوگ کسی ہموار میدان میں بھاگے چلے جا رہے ہوں گے۔ آخر یہ بڑے بڑے پہاڑ اس وقت کہاں چلے جائیں گے؟ اس سوال کا موقع سمجھنے کے لیے اس ماحول کو نگاہ میں رکھیے جس میں یہ تقریر کی جا رہی تھی۔ مکہ جس مقام پر واقع ہے اس کی حالت ایک حوض کی سی ہے جس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ سائل نے انہی پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بات کہی ہوگی۔ اور وحی کے اشارہ سے جواب برملا اسی وقت یہ دے دیا گیا کہ یہ پہاڑ کوٹ پیٹ کر اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے جیسے ریت کے ذرے، اور ان کو دھول کی طرح اڑا کر ساری زمین ایک ایسا ہموار میدان بنا دی جائے گی کہ اس میں کوئی اونچ نیچ نہ رہے گی، کوئی نشیب و فراز نہ ہوگا، اس کی حالت ایک ایسے صاف فرش کی سی ہوگی جس میں ذرا سا بل اور کوئی معمولی سی سلوٹ تک نہ ہو۔

۸۳ عالم آخرت میں زمین کی جو نئی شکل بنے گی اسے قرآن مجید میں مختلف مواقع پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انشقاق میں فرمایا اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ، "زمین پھیلا دی جائے گی۔" سورۂ انفطار میں فرمایا اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ، "سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے،" جس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ سمندروں کی تہیں پھٹ جائیں گی اور سارا پانی زمین کے اندر اتر جائے گا۔ سورۂ تکویر میں فرمایا اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ، "سمندر بھر دیئے جائیں گے یا پاٹ دیئے جائیں گے۔" اور یہاں بتایا جا رہا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے ساری زمین ایک ہموار میدان کی طرح کر دی جائے گی۔ اس سے جو شکل ذہن میں بنتی ہے وہ یہ ہے کہ عالم آخرت میں یہ پورا کرۂ زمین سمندروں کو پاٹ کر، پہاڑوں کو توڑ کر، نشیب و فراز کو ہموار اور جنگلوں کو صاف کر کے بالکل ایک گیند کی طرح بنا دیا جائے گا۔ یہی وہ شکل ہے جس کے متعلق سورۂ ابراہیم کے آخری رکوع میں فرمایا کہ

—— اُس روز سب لوگ منادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے، کوئی ذرا اکڑ نہ دکھا سکے گا اور آوازیں رحمان کے آگے دب جائیں گی، ایک سرسراہٹ[۸۴] کے سوا تم کچھ نہ سنو گے۔ اُس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی الّا یہ کہ کسی کو رحمان اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے[۸۵] —— وہ لوگوں کا اگلا پچھلا

یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ "وہ دن جبکہ زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی"۔ اور یہی زمین کی وہ شکل ہوگی جس پر حشر قائم ہوگا اور اللہ تعالیٰ عدالت فرمائے گا۔ پھر اس کی آخری اور دائمی شکل، وہ بنا دی جائے گی جس کو سورۂ زمر کے آخری رکوع میں یوں بیان فرمایا گیا ہے وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ صَدَقَنَا وَعۡدَہٗ وَاَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّةِ حَیۡثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ "یعنی متقی لوگ کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم سے اپنے وعدے پورے کیے اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا، ہم اس جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخر کار یہ پورا کرۂ ارض جنت بنا دیا جائے گا اور خدا کے صالح و متقی بندے اس کے وارث ہوں گے۔ اُس وقت پوری زمین ایک مُلک ہوگی۔ پہاڑ، سمندر، دریا، صحرا، جو آج زمین کو بے شمار ملکوں اور وطنوں میں تقسیم کر رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ انسانیت کو بھی بانٹے دے رہے ہیں، سرے سے موجود ہی نہ ہوں گے۔

[۸۴] اصل میں لفظ "ہَمس" استعمال ہوا ہے۔ جو قدموں کی آہٹ، چپکے چپکے بولنے کی آواز، اونٹ کے چلنے کی آواز اور ایسی ہی ہلکی آوازوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی آواز، بجز چلنے والوں کے قدموں کی آہٹ اور چپکے چپکے بات کرنے والوں کی کھسر پھسر کے نہیں سنی جائے گی۔ ایک پُرہیبت سماں بندھا ہوا ہوگا۔

[۸۵] اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو متن میں کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ "اُس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی الّا یہ کہ کسی کے حق میں رحمان اس کی اجازت دے اور اس کے لیے بات سننے پر راضی ہو"۔ الفاظ ایسے جامع ہیں جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے روز کسی کو دم مارنے تک کی جرأت نہ ہوگی کجا کہ کوئی سفارش کے لیے بطور خود زبان کھول سکے۔ سفارش وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ بولنے کی اجازت دے، اور اُسی کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے بارگاہِ الٰہی سے سفارش کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں متعدد مقامات پر کھول کر بتا دی گئی ہیں۔ ایک طرف فرمایا مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ "کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے" (بقرہ۔ رکوع ۳۴)۔ اور یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا

سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے[۸۶] لوگوں کے سر اُس حیّ و قیوم کے

لَا يَتَكَلَّمُونَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا "وہ دن جبکہ روح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہونگے، ذرا بات نہ کریں گے، صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے" (النبا۔ رکوع ۲) دوسری طرف ارشاد ہوا وَلَا يَشْفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ "اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر (رحمان) راضی ہو، اور وہ اُس کے خوف سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں" (الانبیاء۔ رکوع ۲) اور وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى "کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سننا چاہے اور پسند کرے" (النجم، رکوع ۲)

۸۶ یہاں وجہ بتائی گئی ہے کہ شفاعت پر یہ پابندی کیوں ہے۔ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء، کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ کس کا ریکارڈ کیسا ہے، کون دنیا میں کیا کرتا رہا ہے، اور اللہ کی عدالت میں کس سیرت و کردار اور کیسی کیسی ذمہ داریوں کے بارے کر آیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کو ہر ایک کے پچھلے کارناموں اور کرتوتوں کا بھی علم ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اب اس کا موقف کیا ہے۔ نیک ہے تو کیسا نیک ہے اور مجرم ہے تو کس درجے کا مجرم ہے۔ معافی کے قابل ہے یا نہیں۔ پوری سزا کا مستحق ہے یا تخفیف اور رعایت بھی اس کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء اور صلحاء کو سفارش کی کھلی چھٹی دے دی جائے اور ہر ایک جس کے حق میں جو سفارش چاہے کر دے۔ ایک معمولی افسر اپنے ذرا سے محکمے میں اگر اپنے ہر دوست یا عزیز کی سفارشیں سننے لگے تو چار دن میں سارے محکمے کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔ پھر بھلا زمین و آسمان کے فرمانروا سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے ہاں سفارشوں کا بازار گرم ہوگا، اور ہر بزرگ جا جا کر جس کو چاہیں گے بخشوا لائیں گے، درآنحالیکہ ان میں سے کسی بزرگ کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ جن لوگوں کی سفارش وہ کر رہے ہیں ان کے نامۂ اعمال کیسے ہیں۔ دنیا میں جو افسر کچھ بھی احساس ذمہ داری رکھتا ہے اس کی روش یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی دوست اس کے کسی قصوروار ماتحت کی سفارش لے کر جاتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ آپ کو خبر نہیں ہے کہ یہ شخص کتنا کام چور، نافرض شناس، رشوت خوار اور خلق خدا کو تنگ

آگے جھک جائیں گے۔ نامراد ہوگا جو اُس وقت کسی ظلم کا بارِ گناہ اٹھائے ہوئے ہو۔ اور کسی ظلم یا حق تلفی کا خطرہ نہ ہوگا اُس شخص کو جو نیک عمل کرے اور اس کے ساتھ وہ مومن بھی ہو۔

اور اے محمدؐ، اِسی طرح ہم نے اسے قرآنِ عربی بنا کر نازل کیا ہے^۵۸^ اور اس میں طرح طرح سے تنبیہات

کرنے والا ہے، میں اس کے کرتوتوں سے واقف ہوں، اس لیے آپ براہِ کرم مجھ سے اس کی سفارش نہ فرمائیں۔ اسی چھوٹی سی مثال پر قیاس کر کے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں شفاعت کے متعلق جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے وہ کس قدر صحیح، معقول اور مبنی بر انصاف ہے۔ خدا کے ہاں شفاعت کا دروازہ بند نہ ہوگا۔ نیک بندے، جو دنیا میں خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرنے کے عادی تھے، انہیں آخرت میں بھی ہمدردی کا حق ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن وہ سفارش کرنے سے پہلے اجازت طلب کریں گے، اور جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انہیں بولنے کی اجازت دے گا صرف اسی کے حق میں وہ سفارش کر سکیں گے۔ پھر سفارش کے لیے بھی شرط یہ ہوگی کہ وہ مناسب اور مبنی برحق ہو، جیسا کہ وَقَالَ صَوَابًا (اور بات ٹھیک کہے) کا ارشادِ ربانی صاف بتا رہا ہے۔ بونگی سفارشیں کرنے کی وہاں اجازت نہ ہوگی کہ ایک شخص دنیا میں سینکڑوں، ہزاروں بندگانِ خدا کے حقوق مار آیا ہو اور کوئی بزرگ اُٹھ کر سفارش کر دیں کہ حضور اسے انعام سے سرفراز فرمائیں۔

^۵۷^ یعنی وہاں فیصلہ ہر انسان کے اوصاف (MERITS) کی بنیاد پر ہوگا۔ جو شخص کسی ظلم کا بارِ گناہ اٹھائے ہوئے آئے گا، خواہ اس نے ظلم اپنے خدا کے حقوق پر کیا ہو، یا خلقِ خدا کے حقوق پر، یا خود اپنے نفس پر، بہرحال یہ چیز اُسے کامیابی کا منہ نہ دیکھنے دیگی۔ دوسری طرف جو لوگ ایمان اور عملِ صالح (محض عملِ صالح نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح، اور محض ایمان بھی نہیں بلکہ عملِ صالح کے ساتھ ایمان) لیے ہوئے آئیں گے، اُن کے لیے وہاں نہ تو اس امر کا کوئی اندیشہ ہے کہ ان پر ظلم ہوگا، یعنی خواہ مخواہ بے قصور اُن کو سزا دی جائے گی، اور نہ اسی امر کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا جائے گا اور ان کے جائز حقوق مار کھائے جائیں گے۔

^۵۸^ یعنی ایسے ہی مضامین اور تعلیمات اور نصائح سے لبریز۔ اس کا اشارہ اُن تمام مضامین کی طرف ہے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، نہ کہ محض قریبی مضمون کی طرف جو اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے۔ اور اس کا سلسلۂ بیان اُن آیات سے جڑتا ہے جو قرآن کے متعلق آغازِ سورہ اور پھر قصہ موسیٰ کے اختتام پر ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مَا تَذْکِرَۃً

کی ہیں شاید کہ یہ لوگ کج روی سے بچیں یا ان میں کچھ ہوش کے آثار اس کی بدولت پیدا ہوں۔ ۸۹

پس بالا و برتر ہے اللہ، پادشاہِ حقیقی۔ ۹۰

اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ تمہاری طرف اُس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے، اور دعا کرو کہ اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر۔ ۹۱

جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، اور وہ "ذکر" جو ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو عطا کیا ہے، اس شان کا تذکرہ اور ذکر ہے۔

۸۹ یعنی اپنی غفلت سے چونکیں، بھولے ہوئے سبق کو کچھ یاد کریں، اور ان کو کچھ اس امر کا احساس ہو کہ کن راہوں میں بھٹکے چلے جا رہے ہیں اور اس گمراہی کا انجام کیا ہے۔

۹۰ اس طرح کے فقرے قرآن میں بالعموم ایک تقریر کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جاتے ہیں، اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ کلام کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پر ہو۔ انداز بیان اور سیاق و سباق پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک تقریر ختم ہو گئی ہے اور ولقد عھدنا الیٰ ادم سے دوسری تقریر شروع ہوتی ہے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں تقریریں مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہوں گی اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم الٰہی کے تحت ان کو ایک سورہ میں جمع کر دیا ہو گا۔ جمع کرنے کی وجہ دونوں کے مضمون کی مناسبت ہے جس کو ابھی ہم واضح کریں گے۔

۹۱ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ پر تقریر ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد رخصت ہوتے ہوئے فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بات پر متنبہ کرتا ہے جو وحی نازل کرنے کے دوران میں اس کے مشاہدے میں آئی۔ بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا گیا، اس لیے پیغام کی ترسیل مکمل کرنے کے بعد اب وہ اس پر ٹوک رہا ہے۔ بات کیا تھی جس پر یہ تنبیہ کی گئی؟ اسے خود تنبیہ کے الفاظ ہی ظاہر کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اسے یاد کرنے اور زبان سے دُہرانے کی کوشش فرما رہے ہوں گے۔ اس کوشش کی وجہ سے آپ کی توجہ بار بار بٹ جاتی ہو گی۔ سلسلۂ اخذِ وحی میں خلل واقع ہو رہا ہو گا۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح مرکوز نہ ہو رہی ہو گی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ آپ کو پیغامِ وحی وصول کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا جائے، اور بیچ بیچ میں یاد کرنے کی کوشش جو آپ کرتے ہیں اس سے منع کر دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ طٰہٰ کا یہ حصہ ابتدائی زمانے کی وحیوں میں سے ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جبکہ

ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا،[۹۲] مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم[۹۳]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی اخذِ وحی کی عادت اچھی طرح نہ پڑی تھی، آپ سے کئی مرتبہ یہ فعل سرزد ہوا ہے اور ہر موقع پر کوئی نہ کوئی فقرہ اس پر آپ کو متنبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ سورۂ قیامہ کے نزول کے موقع پر بھی یہی ہوا تھا اور اس پر سلسلۂ کلام کو توڑ کر آپ کو ٹوکا گیا کہ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۔ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۔ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۔ "اسے یاد کرنے کی جلدی میں اپنی زبان کو بار بار حرکت نہ دو، اسے یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ لہٰذا جب ہم اسے سنا رہے ہوں تو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے" سورۂ اعلیٰ میں بھی آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہم اسے پڑھوا دیں گے اور آپ بھولیں گے نہیں، سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۔ بعد میں جب آپ کو پیغاماتِ وحی وصول کرنے کی اچھی مہارت حاصل ہو گئی تو اس طرح کی کیفیات آپ پر طاری ہونی بند ہو گئیں۔ اسی وجہ سے بعد کی سورتوں میں ایسی کوئی تنبیہ ہمیں نہیں ملتی۔

۹۲ جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے، یہاں سے ایک الگ تقریر شروع ہوتی ہے جو غالباً اوپر والی تقریر کے بعد کسی وقت نازل ہوئی ہے اور مضمون کی مناسبت سے اس کے ساتھ ملا کر ایک ہی سورہ میں جمع کر دی گئی ہے۔ مضمون کی مناسبتیں متعدد ہیں۔ مثلاً یہ کہ:-

(۱) وہ بھولا ہوا سبق جسے قرآن یاد دلا رہا ہے وہی ہے جو نوعِ انسانی کی پیدائش کے آغاز میں دیا گیا تھا اور جسے یاد دلاتے رہنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا، اور جسے یاد دلانے کے لیے قرآن سے پہلے بھی بار بار "ذکر" آتے رہے ہیں۔

(۲) انسان اس سبق کو بار بار شیطان کے بہکانے سے بھولتا ہے، اور یہ کمزوری وہ آغازِ آفرینش سے برابر دکھا رہا ہے۔ سب سے پہلی بھول اس کے اولین ماں باپ کو لاحق ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اسی لیے انسان اس کا محتاج ہے کہ اس کو پیہم یاد دہانی کرائی جاتی رہے۔

(۳) یہ بات کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا انحصار بالکل اس برتاؤ پر ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اس "ذکر" کے ساتھ وہ کرے گا، آغازِ آفرینش ہی میں صاف صاف بتا دی گئی تھی۔ آج یہ کوئی نئی بات نہیں کہی جا رہی ہے کہ اس کی پیروی کرو گے تو گمراہی و بدبختی سے محفوظ رہو گے ورنہ دنیا و آخرت دونوں میں مبتلائے مصیبت ہو گے۔

نہ پایا ۔ ۹۴ یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ سب تو سجدہ کر گئے،

(۹۲) ایک چیز ہے بھول اور عزم کی کمی اور ارادے کی کمزوری جس کی وجہ سے انسان اپنے ازلی دشمن، شیطان کے بہکائے میں آجائے اور غلطی کر بیٹھے۔ اس کی معافی ہو سکتی ہے بشرطیکہ انسان غلطی کا احساس ہوتے ہی اپنے رویے کی اصلاح کرے اور انحراف چھوڑ کر اطاعت کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری چیز ہے وہ سرکشی اور سرتابی اور خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے مقابلے میں شیطان کی بندگی جس کا ارتکاب فرعون اور سامری نے کیا۔ اس چیز کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کا انجام وہی ہے جو فرعون اور سامری نے دیکھا اور یہ انجام ہر وہ شخص دیکھے گا جو اس روش پر چلے گا۔

۹۳ آدم علیہ السلام کا قصہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف (دو مقامات پر)، سورۂ حجر، سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف میں گزر چکا ہے۔ یہ ساتواں موقع ہے جبکہ اسے دہرایا جا رہا ہے۔ ہر جگہ سلسلۂ بیان سے اس کی مناسبت الگ ہے اور ہر جگہ اسی مناسبت کے لحاظ سے قصے کی تفصیلات مختلف طریقے سے بیان کی گئی ہیں۔ قصے کے جو اجزاء ایک جگہ کے موضوع بحث سے مناسبت رکھتے ہیں وہ اسی جگہ بیان ہوئے ہیں، دوسری جگہ وہ نہ ملیں گے۔ یا طرز بیان ذرا مختلف ہو گا۔ پورے قصے کو اور اس کی پوری معنویت کو سمجھنے کے لیے ان تمام مقامات پر نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ ہم نے ہر جگہ اس کے ربط و تعلق اور اس سے نکلنے والے نتائج کو اپنے حواشی میں بیان کر دیا ہے۔

۹۴ یعنی اُس نے بعد میں اس حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ استکبار اور قصدی و ارادی سرکشی کی بنا پر نہ تھا بلکہ غفلت اور بھول میں پڑ جانے اور عزم و ارادے کی کمزوری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس نے حکم کی خلاف ورزی کچھ اس خیال اور نیت کے ساتھ نہیں کی تھی کہ میں خدا کی کیا پروا کرتا ہوں، اُس کا حکم ہے تو ہُوا کرے، جو کچھ میرا جی چاہے گا کروں گا، خدا کون ہوتا ہے کہ میرے معاملات میں دخل دے۔ اس کے بجائے اس کی نافرمانی کا سبب یہ تھا کہ اس نے ہمارا حکم یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، بھول گیا کہ ہم نے اسے کیا سمجھایا تھا، اور اس کے ارادے میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ جب شیطان اسے بہکانے آیا اُس وقت وہ ہماری پیشگی تنبیہ اور نصیحت و فہمائش کو (جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) یاد کرتا اور اس کے دیے ہوئے لالچ کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرتا۔

بعض لوگوں نے "اُس میں عزم نہ پایا" کا مطلب یہ لیا ہے کہ "ہم نے اس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا" یعنی اس نے

مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدم سے کہا کہ[۹۵] "دیکھو، یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے[۹۶]

جو کچھ کیا بھولے سے کیا، نافرمانی کے عزم کی بنا پر نہیں کیا۔ لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لَمْ نَجِدْ لَہٗ عزماً علی العصیان کہا جاتا نہ کہ محض لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْماً۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کے عزم کا فقدان ہے، نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔ علاوہ بریں اگر موقع و محل اور سیاق و سباق کی مناسبت کو دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے یہ قصہ بیان نہیں کر رہا ہے، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور اُن سے ہوا اور جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے پھندے میں پھنسی اور پھنستی رہی ہے۔ مزید براں، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر اس آیت کو پڑھے گا اس کے ذہن میں پہلا مفہوم یہی آئے گا کہ "ہم نے اس میں اطاعتِ امر کا عزم، یا مضبوط ارادہ نہ پایا"۔ دوسرا مفہوم اس کے ذہن میں اُس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ آدم علیہ السلام کی طرف معصیت کی نسبت کو نامناسب سمجھ کر آیت کے کسی اور معنی کی تلاش شروع نہ کر دے۔ یہی بات ہے جو حضرت عمرؓ نے ابنِ عباس سے اس آیت کی یہ تفسیر سن کر فرمائی تھی کہ "لکن لا یخفی علیک ان ھذا التفسیر غیر متبادر، ولا کثیر المناسبۃ للمقام" مگر تم سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ تفسیر آیت کے الفاظ سن کر فوراً ذہن میں نہیں آتی اور نہ موقع و محل کے ساتھ کچھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے"۔ (ملاحظہ ہو، روح المعانی جلد ۱۶ ص ۲۴۳)

۹۵۔ یہاں وہ اصل حکم بیان نہیں کیا گیا ہے جو آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، یعنی یہ کہ "اس خاص درخت کا پھل نہ کھانا"۔ وہ حکم دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہو چکا ہے۔ اس مقام پر چونکہ بتانے کی اصل چیز صرف یہ ہے کہ انسان کس طرح اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہ اور فہمائش کے باوجود اپنے جانے بوجھے دشمن کے اغوا سے متأثر ہو جاتا ہے، اور کس طرح اس کی یہی کمزوری اس سے وہ کام کرا لیتی ہے جو اس کے اپنے مفاد کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اصل حکم کا ذکر کرنے کے بجائے یہاں اُس فہمائش کا ذکر کیا ہے جو اس حکم کے ساتھ حضرت آدمؑ کو کی گئی تھی۔

۹۶۔ دشمنی کا مظاہرہ اسی وقت ہو چکا تھا۔ آدم اور حوا، دونوں دیکھ چکے تھے کہ ابلیس نے ان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا ہے اور صاف صاف یہ کہہ کر کیا ہے کہ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۔ "میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے"۔ (اعراف۔ رکوع ۲۔ ص۔ رکوع ۵)۔ اَرَءَیْتَکَ

ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے[97] اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستاتی ہے[98]۔ لیکن شیطان نے اُس کو پھسلایا[99]

ھٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیَّ "ذرا دیکھ تو سہی، یہ ہے وہ ہستی جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے"۔ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا "اب کیا میں اسے سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" (بنی اسرائیل۔ رکوع ۷)۔ پھر اس پر بھی اُس نے اکتفا نہ کیا کہ کھلم کھلا اپنے حسد کا اظہار کر دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اُس نے مہلت بھی مانگی کہ مجھے اپنی فضیلت اور اس کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیجیے، میں اِسے بہکا کر آپ کو دکھا دوں گا کہ کیسا ہے یہ آپ کا خلیفہ۔ اعراف، حجر اور بنی اسرائیل میں اس کا یہ چیلنج گزر چکا ہے اور آگے سورۂ صٓ میں بھی آ رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا کہ یہ تمہارا دشمن ہے، تو یہ محض ایک امرِ غیب کی اطلاع نہ تھی، بلکہ ایک ایسی چیز تھی جسے عین برسرِ موقع دونوں میاں بیوی اپنی آنکھوں دیکھ چکے اور اپنے کانوں سن چکے تھے۔

[97] اس طرح یہ بھی دونوں کو بتا دیا گیا کہ اگر اس کے بہکانے میں آ کر تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تو جنت میں نہ رہ سکو گے اور وہ تمام نعمتیں تم سے چھن جائیں گی جو تم کو یہاں حاصل ہیں۔

[98] یہ تشریح ہے اُس مصیبت کی جس میں جنت سے نکلنے کے بعد انسان کو مبتلا ہو جانا تھا۔ اس موقع پر جنت کی بڑی اور اکمل و افضل نعمتوں کا ذکر کرنے کے بجائے اس کی چار بنیادی نعمتوں کا ذکر کیا گیا، یعنی یہ کہ یہاں تمہارے لیے غذا، پانی، لباس اور مسکن کا انتظام سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے، تم کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس سے خود بخود یہ بات آدم و حوا علیہما السلام پر واضح ہو گئی کہ اگر وہ شیطان کے بہکاتے میں آ کر حکمِ سرکار کی خلاف ورزی کریں گے تو جنت سے نکل کر انہیں یہاں کی بڑی نعمتیں تو درکنار، یہ بنیادی آسائشیں تک حاصل نہ رہیں گی۔ وہ اپنی بالکل ابتدائی ضروریات تک کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنی جان کھپانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ جب تک نہ بہائیں گے ایک وقت کی روٹی تک نہ پا سکیں گے۔ معاش کی فکر پہلے ان کی توجہ اور ان کے اوقات اور ان کی قوتوں کا اتنا بڑا حصہ کھینچ لے جائے گی کہ کسی بلند تر مقصد کے لیے کچھ کرنے کی نہ فرصت رہے گی نہ طاقت۔

[99] یہاں قرآن صاف تصریح کرتا ہے کہ آدم و حوا میں سے اصل وہ شخص جس کو شیطان نے وسوسے میں ڈالا

کہنے لگا "آدم - بتاؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے؟"[۱۰۱] آخر کار دونوں (میاں بیوی) اُس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ فوراً ہی اُن کے ستر ایک دوسرے کے آگے کھل گئے اور لگے اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے۔[۱۰۲] آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔[۱۰۳] پھر اُس کے رب نے اسے برگزیدہ

آدم علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت حوا۔ اگرچہ سورۂ اعراف کے بیان کے مطابق مخاطب دونوں ہی تھے اور بہکانے میں دونوں ہی آئے، لیکن شیطان کی وسوسہ اندازی کا رُخ دراصل حضرت آدمؑ ہی کی طرف تھا۔ اس کے برعکس بائبل کا بیان یہ ہے کہ سانپ نے پہلے عورت سے بات کی اور پھر عورت نے اپنے شوہر کو بہکا کر درخت کا پھل اسے کھلایا (پیدائش، باب ۳)۔

[۱۰۱] سورۂ اعراف میں شیطان کی گفتگو کی مزید تفصیل ہم کو یہ ملتی ہے وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ "اور اس نے کہا کہ تمہارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لیے روک دیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ ہو جاؤ، یا ہمیشہ جیتے نہ رہو"۔

[۱۰۲] بالفاظ دیگر نافرمانی کا صدور ہوتے ہی وہ آسائشیں اُن سے چھین لی گئیں جو سرکاری انتظام سے ان کو مہیا کی جاتی تھیں، اور اس کا اولین ظہور لباس چھین جانے کی شکل میں ہُوا۔ غذا، پانی اور مسکن سے محرومی کی نوبت تو بعد کو ہی آنی تھی۔ اس کا پتہ تو بھوک پیاس لگنے پر ہی چل سکتا تھا، اور مکان سے نکالے جانے کی باری بھی بعد ہی میں آسکتی تھی۔ مگر پہلی چیز جس پر نافرمانی کا اثر پڑا وہ سرکاری پوشاک تھی جو اُسی وقت اتروالی گئی۔

[۱۰۳] یہاں اُس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کو وہ اپنا خالق اور رب جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے۔ جنت میں ان کو جو آسائشیں حاصل تھیں ان کا تجربہ انہیں خود ہر وقت ہو رہا تھا۔ شیطان کے حسد اور عداوت کا بھی ان کو براہ راست علم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دینے کے ساتھ ہی بتا دیا تھا کہ یہ تمہارا دشمن تمہیں نافرمانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا تمہیں یہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ شیطان اُن کے سامنے چیلنج دے چکا تھا کہ میں اسے بہکاؤں گا اور اس کی بیخ کنی کر کے چھوڑوں گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود جب شیطان نے ان کو ناصح مشفق اور خیر خواہ دوست کے بھیس میں آکر ایک بہتر حالت

کیا[۱۱۱] - اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے ہدایت بخشی[۱۱۲] اور فرمایا "تم دونوں (فریق، یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اُتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اُس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہو گا۔ اور جو میرے

(زندگی جاوداں اور سلطنت لازوال) کا لالچ دلایا تو وہ اس کی تحریص کے مقابلے میں نہ جم سکے اور پھسل گئے۔ حالانکہ اب بھی خدا پر ان کے عقیدے میں فرق نہ آیا تھا اور اُس کے فرمان کے بارے میں ایسا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ وہ سرے سے واجب الاذعان ہی نہیں ہے۔ بس ایک فوری جذبے نے، جو شیطانی تحریص کے زیر اثر ابھر آیا تھا، ان پر ذھول طاری کر دیا اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے۔ یہی وہ "بھول" اور "فقدانِ عزم" ہے جس کا ذکر قصے کے آغاز میں کیا گیا تھا، اور اسی چیز کا نتیجہ وہ نافرمانی اور بھٹک ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی وہ کمزوری ہے جو ابتدائے آفرینش ہی میں اس سے ظاہر ہوئی، اور بعد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جبکہ یہ کمزوری اس میں نہ پائی گئی ہو۔

[۱۱۱] یعنی شیطان کی طرح راندۂ درگاہ نہ کر دیا، اطاعت کی کوشش میں ناکام ہو کر جہاں وہ گر گئے تھے وہیں انہیں پڑا نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اٹھا کر پھر اپنے پاس بلا لیا اور اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ ایک سلوک وہ ہے جو بالارادہ بغاوت کرنے والے (اور اکڑ اور ہیکڑی دکھانے والے نوکر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا مستحق شیطان تھا اور ہر وہ بندہ ہے جو ڈٹ کر اپنے رب کی نافرمانی کرے اور خم ٹھونک کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ دوسرا سلوک وہ ہے جو اس وفادار بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے جو محض "بھول" اور "فقدانِ عزم" کی وجہ سے قصور کر گزرا ہو، اور پھر ہوش آتے ہی اپنے کیے پر شرمندہ ہو جائے۔ یہ سلوک حضرت آدم و حوا سے کیا گیا، کیونکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ پکار اُٹھے تھے کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ "اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اور اگر تو ہم سے درگزر نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم برباد ہو جائیں گے" (اعراف۔ رکوع ۲)

[۱۱۲] یعنی صرف معاف ہی نہیں کیا، بلکہ آئندہ کے لیے راہ راست بھی بتائی اور اس پر چلنے کا طریقہ بھی سکھایا۔

"ذکر" (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا اُس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی[105] اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے[106] ــــــ وہ کہے گا، "پروردگار، دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں

[105] دنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے تنگ دستی لاحق ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کروڑ پتی بھی ہوگا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اقلیم کا فرمانروا بھی ہوگا تو بے کلی اور بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی دنیوی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گردوپیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کشمکش جاری رہے گی جو اسے کبھی امن و اطمینان اور سچی مسرت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی۔

[106] اس جگہ آدم علیہ السلام کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ جس طریقے سے یہاں، اور قرآن کے دوسرے مقامات پر بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں (واللہ اعلم بالصواب) کہ زمین کی اصل خلافت وہی تھی جو آدم علیہ السلام کو ابتداءً جنت میں دی گئی تھی۔ وہ جنت کہیں آسمانوں میں نہ تھی بلکہ اسی زمین پر کسی بلند خطّے کو جنت بنایا گیا تھا۔ وہاں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا کہ اس کے کھانے پینے اور لباس و مکان کا سارا انتظام سرکار کے ذمہ تھا اور خدمت گار (فرشتے) اُس کے حکم کے تابع تھے۔ اس کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے قطعاً کوئی فکر نہ کرنی پڑتی تھی، تاکہ وہ خلافت کے بزرگ تر اور بلند تر وظائف ادا کرنے کے لیے مستعد ہو سکے۔ مگر اس عہدے پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا تاکہ امیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں اور خوبیاں کیا۔ چنانچہ امتحان لیا گیا اور جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تحریص و اطماع کے اثر میں آکر پھسل جاتا ہے، اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا، اور اس کے علم پر نسیان غالب آجاتا ہے۔ اس امتحان کے بعد آدمؑ اور ان کی اولاد کو مستقل خلافت پر مامور کرنے کے بجائے آزمائشی خلافت دی گئی، اور آزمائش کے لیے ایک مدت (اجل مسمّٰی) جس کا اختتام قیامت پر ہوگا، مقرر کر دی گئی۔ اس آزمائش کے دوران امیدواروں کے لیے معیشت کا سرکاری انتظام ختم کر دیا گیا۔ اب اپنی معاش کا انتظام انہیں خود کرنا ہے۔ البتہ زمین اور اس کی مخلوقات پر ان کے اختیارات برقرار ہیں۔ آزمائش اس بات کی ہے کہ اختیار رکھنے کے باوجود یہ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں، اور اگر بھول لاحق ہوتی ہے، یا تحریص و اطماع کے اثر میں آکر یہ پھسلتے ہیں تو تنبیہ

تذکیر اور تعلیم کا اثر قبول کر کے سنبھلتے بھی ہیں یا نہیں، اور ان کا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے، طاعت کا یا معصیت کا۔ اس آزمائشی خلافت کے دوران میں ہر ایک کے طرزِ عمل کا ریکارڈ محفوظ رہے گا۔ اور یوم الحساب میں جو لوگ کامیاب نکلیں گے انہی کو پھر مستقل خلافت، اُس دائمی زندگی اور لازوال سلطنت کے ساتھ جس کا لالچ دے کر شیطان نے حکم کی خلاف ورزی کرائی تھی، عطا کی جائے گی۔ اُس وقت یہ پوری زمین جنت بنا دی جائے گی اور اس کے وارث خدا کے وہ صالح بندے ہوں گے جنھوں نے آزمائشی خلافت میں طاعت پر قائم رہ کر، یا بھول لاحق ہونے کے بعد بالآخر طاعت کی طرف پلٹ کر اپنی اہلیت ثابت کر دی ہو گی۔ جنت کی اس زندگی کو جو لوگ محض کھانے پینے اور اینڈنے کی زندگی سمجھتے ہیں ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہاں پیہم ترقی ہو گی بغیر اس کے کہ اس کے لیے کسی تنزل کا خطرہ ہو اور وہاں خلافتِ الٰہی کے عظیم الشان کام انسان انجام دے گا بغیر اس کے کہ اسے پھر کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ مگر ان ترقیات اور اُن خدمات کا تصور کرنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک بچے کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ بڑا ہو کر جب وہ شادی کرے گا تو ازدواجی زندگی کی کیفیات کیا ہوں گی۔ اسی لیے قرآن میں جنت کی زندگی کے صرف انہی لذائذ کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم اس دنیا کی لذتوں پر قیاس کر کے کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ آدم و حوا کا قصہ جس طرح بائیبل میں بیان ہوا ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ "خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا۔ اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اُس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔" "اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔" "اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا۔ کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔" "اور خداوند خدا اُس پسلی سے جو اُس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا۔" "اور آدم اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے۔" "اور سانپ کُل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا، چالاک تھا اور اُس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟" "سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔"

مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا " ہاں، اِسی طرح تو ہماری آیات کو، جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں، تُو نے بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تو بُھلایا جا رہا ہے"[۱۱۰] ــــــــــ اِس طرح ہم حد سے

چنانچہ عورت نے اس کا پھل لے کر کھایا اور اپنے شوہر کو بھی کھلایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لیے لُنگیاں بنائیں۔ اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سُنی اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ پھر خدا نے آدم کو پکارا کہ تو کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ میں تیری آواز سن کر ڈرا اور چھپ گیا کیونکہ میں ننگا تھا۔ خدا نے کہا ارے، تجھ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ تو ننگا ہے۔ ضرور تو نے اُس درخت کا پھل کھایا ہوگا جس سے میں نے منع کیا تھا۔ آدم نے کہا کہ مجھے حوّا نے اس کا پھل کھلایا، اور حوا نے کہا مجھے سانپ نے بہکایا تھا۔ اس پر خدا نے سانپ سے کہا " اس لیے کہ تو نے یہ کیا تو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھیرا۔ تو اپنے پیٹ کے بل چلیگا اور عمر بھر خاک چاٹے گا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا " اور عورت کو یہ سزا دی کہ " میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا " اور آدم کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور میرے حکم کے خلاف کیا؟ اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا۔ . . . تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا " پھر" خداوند نے آدم اور اس کی بیوی کے واسطے چمڑے کے کُرتے بنا کر ان کو پہنائے۔" اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہوگیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لیے خداوند خدا نے اُس کو باغ عدن سے باہر کر دیا "
(پیدائش، باب ۲- آیات ۷- ۲۵- باب ۳- آیات ۱- ۲۴)۔

بائیبل کے اس بیان اور قرآن کے بیان کو ذرا وہ لوگ بالمقابل رکھ کر دیکھیں جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ قرآن میں یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔

[۱۱۰] قیامت کے روز نئی زندگی کے آغاز سے لے کر جہنم میں داخل ہونے تک جو مختلف کیفیات مجرمین پر

گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں[۱۰۸]، اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیر پا ہے۔

پھر کیا ان لوگوں کو[۱۰۹] (تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو

گزریں گی اُن کو قرآن مجید میں مختلف مواقع پر جدا جدا بیان کیا گیا ہے۔ ایک کیفیت یہ ہے: لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ، "تو اس چیز سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، اب ہم نے تیرے آگے سے پردہ ہٹا دیا ہے، آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے"۔ یعنی تجھے خوب نظر آ رہا ہے (ق۔ رکوع ۲)۔ دوسری کیفیت یہ ہے إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ، "اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں، سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں، نظریں اوپر جمی ہیں اور دل ہیں کہ اُڑے جاتے ہیں"۔ (ابراہیم۔ رکوع ۷)۔ تیسری کیفیت یہ ہے وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا، "اور قیامت کے روز ہم اس کے لیے ایک نوشتہ نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب پائے گا۔ پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے"۔ (بنی اسرائیل۔ رکوع ۲)۔ اور انہی کیفیات میں سے ایک یہ بھی ہے جو آیت زیر بحث میں بیان ہوئی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ لوگ آخرت کے ہولناک مناظر اور اپنی شامتِ اعمال کے نتائج کو خوب دیکھیں گے لیکن بس ان کی بینائی یہی کچھ دیکھنے کے لیے ہوگی۔ باقی دوسری حیثیتوں سے ان کا حال اُس اندھے کا سا ہو گا جسے اپنا راستہ نظر نہ آتا ہو، جو نہ لاٹھی رکھتا ہو کہ ٹٹول کر چل سکے، نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کے چلانے والا ہو، قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہا ہو، اور اس کو کچھ نہ سوجھتا ہو کہ کدھر جائے اور اپنی ضروریات کہاں سے پوری کرے۔ اسی کیفیت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ "جس طرح تو نے ہماری آیات کو بھلا دیا تھا اُسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے"، یعنی آج کوئی پروا نہ کی جائے گی کہ تو کہاں کہاں ٹھوکریں کھا کر گرتا ہے اور کیسی کیسی محرومیاں برداشت کر رہا ہے۔ کوئی تیرا ہاتھ نہ پکڑے گا، کوئی تیری حاجتیں پوری نہ کریگا، اور تیری کچھ بھی خبر گیری نہ کی جائے گی۔

[۱۰۸] اشارہ ہے اُس "تنگ زندگی" کی طرف جو اللہ کے "ذکر" یعنی اس کی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے

ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں ؟ درحقیقت اس میں[۱۲۰] بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقلِ سلیم رکھنے والے ہیں ۔

اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا۔ پس اے محمدؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی،[۱۱۱]

درسِ نصیحت سے منہ موڑنے والوں کو دنیا میں بسر کرائی جاتی ہے۔

۱۰۹ اشارہ ہے اہلِ مکہ کی طرف جو اس وقت مخاطب تھے۔

۱۱۰ یعنی تاریخ کے اس سبق میں، آثارِ قدیمہ کے اس مشاہدے میں، نسلِ انسانی کے اس تجربے میں۔

۱۱۱ یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو ابھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا، اور ان کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر کر چکا ہے اس لیے اُس کی دی ہوئی اس مہلت کے دوران میں یہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ کریں اُس کو تمہیں برداشت کرنا ہو گا اور صبر کے ساتھ ان کی تمام تلخ و شیریں باتیں سنتے ہوئے اپنا فریضۂ تبلیغ و تذکیر انجام دینا پڑے گا۔ اس تحمل و برداشت اور اس صبر کی طاقت تمہیں نماز سے ملے گی جس کو تمہیں ان اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

"رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح" کرنے سے مراد نماز ہے، جیسا کہ آگے چل کر خود فرمایا وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۔ "اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو" نماز کے اوقات کی طرف یہاں بھی صاف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے فجر کی نماز۔ سورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی نماز۔ اور رات کے اوقات میں عشا اور تہجد کی نماز۔ رہے دن کے کنارے، تو وہ تین ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک کنارہ صبح ہے، دوسرا کنارہ زوالِ آفتاب، اور تیسرا کنارہ شام۔ لہٰذا دن کے کناروں سے مراد فجر، ظہر اور مغرب کی نماز ہی ہو سکتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۳۶

شاید کہ تم راضی ہو جاؤ[112]۔ اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیوی زندگی کی اُس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال[113] ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو[114] اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم ہی دے رہے ہیں۔ اور انجام کی

---

[112] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنی موجودہ حالت پر راضی ہو جاؤ جس میں اپنے مشن کی خاطر تمہیں طرح طرح کی ناگوار باتیں سہنی پڑ رہی ہیں، اور اللہ کے اس فیصلے پر راضی ہو جاؤ کہ تم پر ناحق ظلم اور زیادتیاں کرنے والوں کو ابھی سزا نہیں دی جائے گی، وہ داعیِ حق کو ستاتے بھی رہیں گے اور زمین میں دندناتے بھی پھریں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ذرا یہ کام کر کے تو دیکھو، اس کا نتیجہ وہ کچھ سامنے آئے گا جس سے تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔ یہ دوسرا مطلب قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں نماز کا حکم دینے کے بعد فرمایا عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا "توقع ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقامِ محمود پر پہنچا دے گا" (رکوع ۹)۔ اور سورۂ ضحیٰ میں فرمایا وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی "تمہارے لیے بعد کا دور یقیناً پہلے دور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمہارا رب تمہیں اتنا کچھ دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

[113] رزق کا ترجمہ ہم نے "رزقِ حلال" کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی حرام مال کو "رزقِ رب" سے تعبیر نہیں فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا اور تمہارے ساتھی اہلِ ایمان کا یہ کام نہیں ہے کہ یہ فساق و فجار ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنی زندگی میں جو ظاہری چمک دمک پیدا کر لیتے ہیں، اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھو۔ یہ دولت اور یہ شان و شوکت تمہارے لیے ہرگز قابلِ رشک نہیں ہے۔ جو پاک رزق تم اپنی محنت سے کماتے ہو وہ خواہ کتنا ہی تھوڑا ہو، راستباز اور ایماندار آدمیوں کے لیے وہی بہتر ہے اور اسی میں وہ بھلائی ہے جو دنیا سے آخرت تک برقرار رہنے والی ہے۔

[114] یعنی تمہارے بال بچے بھی اپنی تنگ دستی و خستہ حالی کے مقابلہ میں ان حرام خوروں کے عیش و عشرت کو دیکھ کر دل شکستہ نہ ہوں۔ ان کو تلقین کرو کہ نماز پڑھیں۔ یہ چیز ان کے زاویۂ نظر کو بدل دے گی۔ ان کے معیارِ قدر کو بدل دے گی۔

بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔[۱۱۵]

وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا۔ اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں آگیا؟[۱۱۶] اگر ہم اُس کے آنے سے پہلے اِن کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار، تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے۔ اَے محمدؐ، اِن سے کہو، ہر ایک انجامِ کار کے انتظار میں[۱۱۷] ہے، پس اب منتظر رہو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والے ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔ ع

ان کی توجہات کا مرکز بدل دے گی۔ وہ پاک رزق پر صابر و قانع ہو جائیں گے اور اس بھلائی کو جو ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اُس عیش پر ترجیح دینے لگیں گے جو فسق و فجور اور دنیا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔

[۱۱۵] یعنی ہم نماز پڑھنے کے لیے تم سے اس لیے نہیں کہتے کہ اس سے ہمارا کوئی فائدہ ہے۔ فائدہ تمہارا اپنا ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو گا جو دنیا اور آخرت دونوں ہی میں آخری اور مستقل کامیابی کا وسیلہ ہے۔

[۱۱۶] یعنی کیا یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ انہی میں سے ایک اُمّی شخص نے وہ کتاب پیش کی ہے جس میں شروع سے اب تک کی تمام کتبِ آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اُن کتابوں میں جو کچھ تھا، وہ سب نہ صرف یہ کہ اس میں جمع کر دیا گیا، بلکہ اس کو ایسا کھول کر واضح بھی کر دیا گیا کہ صحرانشین بدو تک اس کو سمجھ کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

[۱۱۷] یعنی جب سے یہ دعوت تمہارے شہر میں اُٹھی ہے، نہ صرف اِس شہر کا بلکہ گرد و پیش کے علاقے کا بھی ہر شخص انتظار کر رہا ہے کہ اس کا انجام آخرکار کیا ہوتا ہے۔

الانبیاء

نام | اس سورت کا نام کسی خاص آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ چونکہ اس میں مسلسل بہت سے انبیاء کا ذکر آیا ہے، اس لیے اس کا نام "انبیاء" رکھ دیا گیا۔ یہ بھی موضوع کے لحاظ سے سورۃ کا عنوان نہیں ہے بلکہ محض پہچاننے کے لیے ایک علامت ہے۔

زمانۂ نزول | مضمون اور اندازِ بیان، دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکے کا دورِ متوسط، یعنی ہماری تقسیم کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا تیسرا دَور ہے۔ اس کے پس منظر میں حالات کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو آخری دَور کی سورتوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

موضوع و مضمون | اس سورہ میں وہ کشمکش زیرِ بحث ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سردارانِ قریش کے درمیان برپا تھی۔ وہ لوگ آنحضرت کے دعوائے رسالت اور آپ کی دعوتِ توحید و عقیدۂ آخرت پر جو شکوک اور اعتراضات پیش کرتے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے آپ کی مخالفت میں جو چالیں چلی جا رہی تھیں ان پر زجر و توبیخ کی گئی ہے اور ان حرکتوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ جس غفلت اور بے پروائی سے آپ کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے اُس پر متنبہ کیا گیا ہے اور آخر میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جس شخص کو تم اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھ رہے ہو وہ دراصل تمہارے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔

دورانِ تقریر میں خاص طور پر جو امور زیرِ بحث آئے ہیں وہ یہ ہیں :۔

۱۔ کفارِ مکہ کی یہ غلط فہمی کہ بشر کبھی رسول نہیں ہو سکتا اور اس بنا پر ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے سے انکار کرنا ــــ اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔

۲۔ اُن کا آپ پر اور قرآن پر مختلف اور متضاد قسم کے اعتراضات کرنا اور کسی ایک بات پر نہ جمنا ــــ

— اس پر مختصر مگر نہایت پُرزور اور ذہن خیز طریقے سے گرفت کی گئی ہے۔

۳- اُن کا یہ تصور کہ زندگی بس ایک کھیل ہے جسے چند روز کھیل کر یونہی ختم ہو جانا ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا ہے۔ کسی حساب کتاب اور جزا و سزا سے سابقہ نہیں پیش آنا ہے — یہ چیز چونکہ اُس غفلت و بے اعتنائی کی اصل جڑ تھی جس کے ساتھ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے، اس لیے بڑے ہی مؤثر انداز میں اس کا توڑ کیا گیا ہے۔

۴- شرک پر ان کا اصرار اور توحید کے خلاف ان کا جاہلانہ تعصب جو ان کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اصل بنائے نزاع تھا — اس کی اصلاح کے لیے شرک کے خلاف اور توحید کے حق میں مختصر مگر بہت وزنی اور دلنشین دلائل دیے گئے ہیں۔

۵- ان کی یہ غلط فہمی کہ نبی کو بار بار جھٹلانے کے باوجود اُن پر کوئی عذاب نہیں آتا تو ضرور نبی جھوٹا ہے اور عذاب الٰہی کی وہ وعیدیں جو وہ خدا کی طرف سے ہمیں سناتا ہے محض خالی خولی دھمکیاں ہیں — اس کو استدلال اور نصیحت، دونوں طریقوں سے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کے اہم واقعات سے چند نظیریں پیش کی گئی ہیں جن سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تمام وہ پیغمبر جو انسانی تاریخ کے دوران میں خدا کی طرف سے آئے تھے، انسان تھے اور نبوت کے امتیازی وصف کو چھوڑ کر دوسری صفات میں وہ ویسے ہی انسان ہوتے تھے جیسے دنیا کے عام انسان ہوا کرتے ہیں۔ الوہیت اور خدائی کا ان میں شائبہ تک نہ تھا بلکہ اپنی ہر ضرورت کے لیے وہ خود خدا کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اس کے ساتھ انہی تاریخی نظیروں سے دو باتیں اور بھی واضح کی گئی ہیں ایک یہ کہ انبیاء پر طرح طرح کے مصائب آتے ہیں، اور ان کے مخالفین نے بھی ان کو برباد کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی طریقوں پر ان کی نصرت فرمائی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام انبیاء کا دین ایک تھا اور وہ وہی دین تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ نوعِ انسانی کا اصل دین یہی ہے، اور باقی جتنے مذاہب دنیا میں بنے ہیں وہ محض گمراہ انسانوں کے ڈالے ہوئے تفرقے ہیں۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی نجات کا انحصار اسی دین کی پیروی اختیار کرنے پر ہے۔ جو لوگ اسے قبول کریں گے وہی خدا کی آخری عدالت سے کامیاب نکلیں گے اور زمین کے وارث ہونگے۔ اور جو لوگ اسے رد کر دیں گے وہ آخرت میں بدترین انجام سے دوچار ہونگے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی مہربانی ہے کہ وہ فیصلے کے وقت سے پہلے اپنے نبی کے ذریعے سے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو نبی کی آمد کو اپنے لیے رحمت کے بجائے زحمت سمجھ رہے ہیں۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

قریب آ لگا ہے لوگوں کے حساب کا وقت[1]، اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں[2]۔ اُن کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے[3]، اس کو بتکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں[4]، دل ان کے (دوسری ہی فکروں میں) منہمک ہیں۔

---

[1] مراد ہے قرب قیامت۔ یعنی اب وہ وقت دور نہیں ہے جب لوگوں کو اپنا حساب دینے کے لیے اپنے رب کے آگے حاضر ہونا پڑے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس بات کی علامت ہے کہ نوع انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے آغاز کی بہ نسبت اپنے انجام سے قریب تر ہے۔ آغاز اور وسط کے مرحلے گزر چکے ہیں اور آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا بعثت انا والساعۃ کھاتین "میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں"۔ یعنی میرے بعد بس قیامت ہی ہے۔ کسی اور نبی کی دعوت بیچ میں حائل نہیں ہے۔ سنبھلنا ہے تو میری دعوت پر سنبھل جاؤ۔ کوئی اور ہادی اور بشیر و نذیر آنے والا نہیں ہے۔

[2] یعنی کسی تنبیہ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ نہ خود سوچتے ہیں کہ ہمارا انجام کیا ہونا ہے اور نہ اُس پیغمبر کی بات سنتے ہیں جو انہیں خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

[3] یعنی قرآن کی ہر نئی سورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے اور انہیں سنائی جاتی ہے۔

اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ "یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے؟"[شہ]

لکہ وَھُمْ یَلْعَبُوْنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اوپر ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے، اور اس میں کھیل سے مراد یہی زندگی کا کھیل ہے جسے خدا اور آخرت سے غافل لوگ کھیل رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنتے بلکہ کھیل اور مذاق کے طور پر سنتے ہیں۔

شہ "پھنسے جاتے ہو" بھی ترجمہ ہو سکتا ہے، اور دونوں ہی مطلب صحیح ہیں۔ سرگوشیاں کفار مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار آپس میں بیٹھ بیٹھ کر کیا کرتے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کی بڑی فکر لاحق تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص بہر حال نبی تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ ہم ہی جیسا انسان ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جو اس کو ہم سے ممتاز کرتی ہو، اور ہماری بہ نسبت اس کو خدا سے ایک غیر معمولی تعلق کا مستحق بناتی ہو۔ البتہ اس شخص کی باتوں میں اور اس کی شخصیت میں ایک جادو ہے کہ جو اس کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو نہ اس کی سنو اور نہ اس سے میل جول رکھو، کیونکہ اس کی باتیں سننا اور اس کے قریب جانا گویا آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنسنا ہے۔

جس چیز کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "سحر" کا الزام چسپاں کرتے تھے اس کی چند مثالیں آپ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۲ھ) نے بیان کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ عُتبہ بن ربیعہ نے سرداران قریش سے کہا، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں محمدؐ سے جا کر ملوں اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ یہ حضرت حمزہ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تعداد روز بروز بڑھتے دیکھ کر اکابر قریش سخت پریشان ہو رہے تھے۔ لوگوں نے کہا ابو الولید، تم پر پورا اطمینان ہے، ضرور جا کر اس سے بات کرو۔ وہ حضورؐ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، "بھتیجے، ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی، تم خود جانتے ہو، اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا۔ اس کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی۔ باپ دادا جو مر چکے ہیں ان سب کو تم نے

گمراہ اور کافر بنایا۔ بھتیجے، اگر ان باتوں سے تمہارا مقصد دنیا میں اپنی بڑائی قائم کرنا ہے تو آؤ ہم سب مل کر تم کو اتنا روپیہ دیے دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ سرداری چاہتے ہو تو ہم تمہیں سردار مانے لیتے ہیں۔ بادشاہی چاہتے ہو تو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اور اگر تمہیں کوئی بیماری ہو گئی ہے جس کی وجہ سے تم کو واقعی سوتے یا جاگتے میں کچھ نظر آنے لگا ہے تو ہم سب مل کر بہترین طبیبوں سے تمہارا علاج کرائے دیتے ہیں" یہ باتیں وہ کرتا رہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش سنتے رہے۔ جب وہ خوب بول چکا تو آپ نے فرمایا "ابوالولید، جو کچھ آپ کہنا چاہتے تھے کہہ چکے ہیں، یا اور کچھ کہنا ہے؟" اس نے کہا "بس جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا" آپ نے فرمایا "اچھا اب میری سنو۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حٰمٓ۔ تنزیل من الرحمٰن الرحیم۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مسلسل آپ سورۂ حٰمٓ السجدہ کی تلاوت فرماتے رہے اور عتبہ پیچھے زمین پر ہاتھ ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ اڑتیسویں آیت پر پہنچ کر آپ نے سجدہ کیا، اور پھر سر اٹھا کر عتبہ سے فرمایا "ابوالولید، جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام" عتبہ یہاں سے اٹھ کر سرداران قریش کی طرف پلٹا تو لوگوں نے دور سے ہی اس کو آتے دیکھ کر کہا "خدا کی قسم، ابوالولید کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر وہ گیا تھا" اس کے پہنچتے ہی لوگوں نے سوال کیا "کہو ابوالولید، کیا کر آئے؟" اس نے کہا "خدا کی قسم، آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ واللہ یہ شعر نہیں ہے، نہ سحر ہے، اور نہ کہانت۔ اے معشر قریش، میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی باتیں جو میں نے سنی ہیں رنگ لا کر رہیں گی۔ اگر عرب اس پر غالب آگئے تو اپنے بھائی کا خون تمہاری گردن پر نہ ہو گا، دوسروں پر ہو گا۔ اور اگر یہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہو گی اور اس کی عزت تمہاری عزت۔" لوگوں نے کہا "واللہ، ابوالولید تم پر بھی اس کا جادو چل گیا" اس نے کہا "یہ میری رائے ہے، اب تم جانو اور تمہارا کام" (ابن ہشام، جلد اول، ص ۳۱۳-۳۱۴) بیہقی نے اس واقعہ کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب حضورؐ سورۂ حٰمٓ السجدہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے کہ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ، تو عتبہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا کہ خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔

رسول نے کہا میرا رب ہر اُس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے، وہ سمیع اور علیم ہے؀

دوسرا واقعہ ابن اسحاق نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ قبیلۂ اَراش کا ایک شخص کچھ اونٹ لے کر مکہ آیا۔ ابوجہل نے اس کے اونٹ خرید لیے اور جب اس نے قیمت طلب کی تو ٹال مٹول کرنے لگا۔ اَراشی نے تنگ آکر ایک روز حرمِ کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا پکڑا اور مجمع عام میں فریاد شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سردارانِ قریش نے اس شخص سے کہا "ہم کچھ نہیں کر سکتے، دیکھو وہ صاحب جو اس کونے میں بیٹھے ہیں، ان سے جا کر کہو، وہ تم کو تمہارا روپیہ دلوا دیں گے"۔ اَراشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا، اور قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا "آج لطف آئے گا"۔ اَراشی نے جا کر حضور سے اپنی شکایت بیان کی۔ آپ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابوجہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے پیچھے ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ گزرے اس کی خبر لا کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ابوجہل کے دروازے پر پہنچے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا "کون؟" آپ نے جواب دیا "محمدؐ"۔ وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپ نے اس سے کہا "اِس شخص کا حق ادا کر دو"۔ اس نے جواب میں کوئی چون و چرا نہ کی، اندر گیا اور اس کے اونٹوں کی قیمت لا کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ قریش کا مخبر یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا اور سرداروں کو سارا ماجرا سنا دیا اور کہنے لگا کہ واللہ آج وہ عجیب معاملہ دیکھا جو کبھی نہ دیکھا تھا، حکم بن ہشام (ابوجہل) جب نکلا ہے تو محمدؐ کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا اور جب محمدؐ نے اس سے کہا کہ اس کا حق ادا کر دو تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے حکم بن ہشام کے جسم میں جان نہیں ہے۔ (ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۹-۳۰)

یہ تھا شخصیت اور سیرت و کردار کا اثر اور وہ تھا کلام کا اثر، جس کو وہ لوگ جادو قرار دیتے تھے اور ناواقف لوگوں کو یہ کہہ کہہ کر ڈراتے تھے کہ اس شخص کے پاس نہ جانا ورنہ جادو کر دے گا۔

؀ یعنی رسول نے کبھی اس جھوٹے پروپیگنڈے اور سرگوشیوں کی اس مہم (WHISPERING CAMPAIGN) کا جواب اس کے سوا نہ دیا کہ تم لوگ جو باتیں بناتے ہو سب کچھ خدا سنتا اور جانتا ہے، خواہ زور سے کہو، خواہ چپکے چپکے کانوں میں پھونکو۔ وہ کبھی بے انصاف دشمنوں کے مقابلے میں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر نہ اتر آیا۔

وہ کہتے ہیں " بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اس کی من گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعرہے۔ ورنہ

ھ اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکہ کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپ کے مقابلے میں پروپیگنڈا کی ایک مہم شروع کی جائے اور ہر اس شخص کو، جو مکہ میں زیارت کے لیے آئے، آپ کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ مہینے جاری رہتی تھی، مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیئے جاتے تھے جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے اور کہتا ہے کہ خدا کا کلام ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ اجی وہ کلام کیا ہے، دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پلندا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ خیالات اور تک بندیاں ہیں جن کا نام اُس نے کلامِ الٰہی رکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے۔ صداقت کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا کہ جم کر کوئی قطعی اور جچی تلی رائے ظاہر کرتے۔ لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انہوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ آپ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدت ہی کے اندر ہو گئی۔ ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو، وہ کون ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہے، اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے، ہم کوئی بچے تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دلچسپ مثال طُفَیل بن عَمرو دوسی کا قصہ ہے جسے ابن اسحاق نے خود اُن کی روایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلۂ دوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف خوب میرے کان بھرے یہاں تک کہ میں آپ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ آپ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں حاضری دی تو آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا

یہ لائے کوئی نشانی جس طرح پرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے" حالانکہ اِن سے کہیں بڑھ کر کوئی بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں شاعر ہوں، جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں، کوئی بچہ نہیں ہوں کہ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کر سکوں۔ آخر کیوں نہ اس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کہتا کیا ہے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر واپس چلے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور آپ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کے متعلق مجھ سے یہ یہ کچھ کہا تھا، اور میں آپ سے اس قدر بدگمان ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی تاکہ آپ کی آواز نہ سننے پاؤں۔ لیکن ابھی جو چند کلمے میں نے آپ کی زبان سے سنے ہیں وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے، آپ کیا کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مجھ کو قرآن کا ایک حصہ سنایا اور میں اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت ایمان لے آیا۔ پھر واپس جا کر میں نے اپنے باپ اور بیوی کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد اپنے قبیلے میں مسلسل اشاعت اسلام کرتا رہا، یہاں تک کہ غزوۂ خندق کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے میرے قبیلے کے ستر اسی گھرانے مسلمان ہو گئے" (ابن ہشام جلد ۲، ص ۲۲ - ۲۴)

ایک اور روایت جو ابن اسحٰق نے نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردارانِ قریش اپنی محفلوں میں خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جو باتیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بناتے ہیں وہ محض جھوٹ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مجلس میں نضر بن حارث نے تقریر کی کہ "تم لوگ محمدؐ کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمہارے درمیان نوعمر جوان تھا تو تمہارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب کہ اس کے بال سفید ہونے کو آگئے، تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا، وہ ساحر نہیں ہے، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھاڑ پھونک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں ان کا ہمیں علم ہے۔ بخدا وہ مجنون بھی نہیں ہے، مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور جیسی بے تکی بڑ وہ ہانکتا ہے کیا اس سے ہم بے خبر ہیں۔ اے سردارانِ قریش، کچھ اور بات سوچو، جس چیز کا مقابلہ تمہیں درپیش ہے وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو" اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے

پہلے کوئی بستی بھی، جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہ لائی۔ اب کیا یہ ایمان لائیں گے؟ [شہ]

اور اے محمدؐ، تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔[۹] تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو۔[نلہ] اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں، اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پورے کیے اور انہیں اور جس جس کو ہم نے چاہا بچا لیا، اور حد سے گزر جانے والوں

رستم اور اسفندیار کے قصے لاکر پھیلائے جائیں تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انہیں قرآن سے زیادہ عجیب معلوم ہوں۔ چنانچہ کچھ دنوں اس پر عمل کیا گیا اور خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔ (ابن ہشام۔ جلد اول ص ۳۲۰-۳۲۱)

شہ اس مختصر سے جملے میں نشانی کے مطالبے کا جو جواب دیا گیا ہے وہ تین مضمونوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ تم پچھلے رسولوں کی سی نشانیاں مانگتے ہو، مگر یہ بھول جاتے ہو کہ ہٹ دھرم لوگ ان نشانیوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تھے۔ دوسرے یہ کہ تم نشانی کا مطالبہ تو کرتے ہو، مگر یہ یاد نہیں رکھتے کہ جس قوم نے بھی صریح معجزہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایمان لانے سے انکار کیا ہے وہ پھر ہلاک ہوئے بغیر نہیں رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ تمہاری منہ مانگی نشانی نہ بھیجنا تو تم پر خدا کی ایک بڑی مہربانی ہے۔ اب تک تم انکار پر انکار کیے جاتے رہے اور مبتلائے عذاب نہ ہوئے۔ کیا اب نشانی اس لیے مانگتے ہو کہ ان قوموں کا سا انجام دیکھو جو نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائیں اور تباہ کر دی گئیں؟

۹ یہ جواب ہے اُن کے اس قول کا کہ "یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے"۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو اس بات کی دلیل قرار دیتے تھے کہ آپ نبی نہیں ہو سکتے۔ جواب دیا گیا کہ پہلے زمانے کے جن لوگوں کو تم خود مانتے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے، وہ سب بھی بشر ہی تھے اور بشر ہوتے ہوئے ہی خدا کی وحی سے سرفراز ہوئے تھے۔

نلہ یعنی یہ یہودی، جو آج اسلام کی دشمنی میں تمہارے ہم نوا ہیں اور تم کو مخالفت کے داؤ پیچ سکھایا کرتے

کو ہلاک کر دیا۔[۱۱]

لوگو، ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟[۱۲]

کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور اُن کے بعد دوسری کسی قوم کو اُٹھایا۔ جب اُن کو ہمارا عذاب محسوس ہوا[۱۳] تو لگے سرپٹ دوڑنے۔ (کہا گیا) "بھاگو نہیں۔ جاؤ اپنے اُنہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے[۱۴]۔" کہنے لگے

ہیں، انہی سے پوچھ لو کہ موسیٰ اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کون تھے۔ انسان ہی تھے یا کوئی اور مخلوق؟

[۱۱] یعنی پچھلی تاریخ کا سبق صرف اتنا ہی نہیں بتاتا کہ پہلے جو رسول بھیجے گئے تھے وہ انسان تھے، بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی نصرت و تائید کے، اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو ہلاک کر دینے کے، جتنے وعدے اللہ نے اُن سے کیے تھے وہ سب پورے ہوئے اور ہر وہ قوم برباد ہوئی جس نے اُن کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ اب تم اپنا انجام خود سوچ لو۔

[۱۲] یہ اکٹھا جواب ہے کفار مکہ کے اُن تمام مضطرب اقوال کا جو وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ یہ شاعری ہے، یہ ساحری ہے، یہ پراگندہ خواب ہیں، یہ من گھڑت افسانے ہیں، وغیرہ۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اس کتاب میں آخر وہ کونسی نرالی بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہ آتی ہو، جس کی وجہ سے اس کے متعلق تم اتنی متضاد رائیں قائم کر رہے ہو۔ اس میں تو تمہارا اپنا ہی حال بیان کیا گیا ہے۔ تمہارے نفسیات اور تمہارے ہی معاملاتِ زندگی زیرِ بحث ہیں۔ تمہاری ہی فطرت اور ساخت اور آغاز و انجام پر گفتگو ہے۔ تمہارے ہی ماحول سے وہ نشانیاں چن چن کر پیش کی گئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اور تمہارے ہی اخلاقی اوصاف میں سے فضائل اور قبائح کا فرق نمایاں کر کے دکھایا جا رہا ہے جس کے صحیح ہونے پر تمہارے اپنے ضمیر گواہی دیتے ہیں۔ ان سب باتوں میں کیا چیز ایسی گنجلک اور پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے سے تمہاری عقل عاجز ہو؟

[۱۳] یعنی جب عذابِ الٰہی سر پہ آ گیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ آ گئی شامت۔

[۱۴] نہایت معنی خیز فقرہ ہے اور اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً: ذرا اچھی طرح اس عذاب کا معائنہ

"ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے" اور وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا، زندگی کا ایک شرارہ تک ان میں نہ رہا۔

ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے[15]۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے[16]۔ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے۔ اور تمہارے لیے تباہی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو[17]۔

کرو تاکہ کل کوئی اس کی کیفیت پوچھے تو ٹھیک بتا سکو۔ اپنے وہی ٹھاٹھ جما کر پھر مجلسیں گرم کرو، شاید اب بھی تمہارے خدم و حشم ہاتھ باندھ کر پوچھیں کہ حضور کیا حکم ہے۔ اپنی وہی کونسلیں اور کمیٹیاں جمائے بیٹھے رہو، شاید اب بھی تمہارے عاقلانہ مشوروں اور مدبرانہ آراء سے استفادہ کرنے کے لیے دنیا حاضر ہو۔

۱۵ یہ تبصرہ ہے اُن کے اس پورے نظریۂ حیات پر جس کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر توجہ نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ انسان دنیا میں بس یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو کچھ چاہے کرے اور جس طرح چاہے جیے۔ کوئی باز پرس اس سے نہیں ہونی ہے۔ کسی کو اسے حساب نہیں دینا ہے۔ چند روز کی بھلی بری زندگی گزار کر سب کو بس یونہی فنا ہو جانا ہے۔ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا ہو۔ یہ خیال درحقیقت اس بات کا ہم معنی تھا کہ کائنات کا یہ سارا نظام محض کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے جس کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہے۔ اور یہی خیال دعوتِ پیغمبر سے ان کی بے اعتنائی کا اصل سبب تھا۔

۱۶ یعنی ہمیں کھیلنا ہی ہوتا تو کھلونے بنا کر ہم خود ہی کھیل لیتے۔ اِس صورت میں یہ ظلم تو ہرگز نہ کیا جاتا کہ خواہ مخواہ ایک ذی حس، ذی شعور، ذمہ دار مخلوق کو پیدا کر ڈالا جاتا۔ اُس کے درمیان حق و باطل کی یہ کشمکشیں اور کھینچا تانیاں کرائی جاتیں، اور محض اپنے لطف و تفریح کے لیے ہم دوسروں کو بلا وجہ تکلیفوں میں ڈالتے۔ تمہارے خدا نے یہ دنیا کچھ رومی اکھاڑے (COLOSSEUM) کے طور پر نہیں بنائی ہے کہ بندوں کو درندوں سے لڑوا کر اور ان کی بوٹیاں نچوا کر خوشی کے ٹھٹھے لگائے۔

۱۷ یعنی ہم بازی گر نہیں ہیں، نہ ہمارا کام کھیل تماشا کرنا ہے۔ ہماری یہ دنیا ایک سنجیدہ نظام ہے

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے اللہ کا ہے [۱۸]۔ اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں [۱۹] وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں [۲۰]۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، دم نہیں لیتے۔

جس میں کوئی باطل چیز جم نہیں سکتی۔ باطل یہاں جب بھی سر اٹھاتا ہے، حقیقت سے اس کا تصادم ہو کر رہتا ہے اور آخر کار وہ مٹ کر ہی رہتا ہے۔ اس دنیا کو اگر تم تماشا گاہ سمجھ کر جیو گے، یا حقیقت کے خلاف باطل نظریات پر کام کرو گے تو نتیجہ تمہاری اپنی ہی تباہی ہو گا۔ نوع انسانی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کہ دنیا کو محض ایک تماشا گاہ، محض ایک خوانِ یغما، محض ایک عیش کدہ سمجھ کر جینے والی، اور انبیاء کی بتائی ہوئی حقیقت سے منہ موڑ کر باطل نظریات پر کام کرنے والی قومیں پے در پے کس انجام سے دوچار ہوتی رہی ہیں۔ پھر یہ کونسی عقلمندی ہے کہ جب سمجھانے والا سمجھائے تو اس کا مذاق اڑاؤ، اور جب اپنے ہی کیے کرتوتوں کے نتائج عذابِ الٰہی کی صورت میں سر پر آ جائیں تو چیخنے لگو کہ "ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے"۔

[۱۸] یہاں سے توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر گفتگو شروع ہوتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکینِ مکہ کے درمیان اصل بنائے نزاع تھی۔ اب مشرکینِ مکہ کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ کائنات کا یہ نظام جس میں تم جی رہے ہو (جس کے متعلق ابھی یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں ہے، جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ ایک سنجیدہ اور بامقصد اور مبنی بر حقیقت نظام ہے، اور جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس میں باطل ہمیشہ حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے) اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس پورے نظام کا خالق، مالک، حاکم اور رب صرف ایک خدا ہے، اور اس حقیقت کے مقابلے میں باطل یہ ہے کہ اسے بہت سے خداؤں کی مشترک سلطنت سمجھا جائے، یا یہ خیال کیا جائے کہ ایک بڑے خدا کی خدائی میں دوسرے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا بھی کچھ دخل ہے۔

[۱۹] یعنی وہی فرشتے جن کو مشرکینِ عرب خدا کی اولاد سمجھ کر، یا خدائی میں دخیل مان کر معبود بنائے ہوئے تھے۔

[۲۰] یعنی خدا کی بندگی کرنا ان کو ناگوار بھی نہیں ہے کہ بادلِ ناخواستہ بندگی کرتے کرتے وہ ملول ہو جاتے ہوں۔ اصل میں لفظ لا یستحسرون استعمال کیا گیا ہے۔ استحسار میں تکان کا مبالغہ پایا جاتا ہے اور

کیا اِن لوگوں کے بنائے ہوئے ارضی خدا ایسے ہیں کہ (بے جان کو جان بخش کر) اُٹھا کھڑا کرتے ہوں؟ [۲۱]
اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین اور آسمان دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ [۲۲]

اس سے مراد وہ نقصان ہے جو کسی ناگوار کام کے کرنے سے لاحق ہوتی ہے۔

[۲۱] اصل میں لفظ "ینشرون" استعمال ہوا ہے جو "اِنشار" سے مشتق ہے۔ اِنشار کے معنی ہیں بے جان پڑی ہوئی چیز کو اٹھا کھڑا کرنا۔ اگرچہ اس لفظ کو قرآن مجید میں بالعموم زندگی بعد موت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لیکن اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر، اصل لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ بے جان مادّے میں زندگی پھونک دینے کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ اور موقع و محل کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن ہستیوں کو انہوں نے خدا قرار دے رکھا ہے اور اپنا معبود بنایا ہے، کیا اُن میں کوئی ایسا ہے جو مادۂ غیر ذی حیات میں زندگی پیدا کرتا ہو؟ اگر ایک اللہ کے سوا کسی میں یہ طاقت نہیں ہے — اور مشرکینِ عرب خود مانتے تھے کہ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے — تو پھر وہ ان کو خدا اور معبود کس لیے مان رہے ہیں؟

[۲۲] یہ استدلال سادہ بھی ہے اور بہت گہرا بھی۔ سادہ سی بات، جس کو ایک بدوی، ایک دیہاتی، ایک موٹی سی سمجھ کا آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے، یہ ہے کہ ایک معمولی گھر کا نظام بھی چار دن بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس کے دو صاحبِ خانہ ہوں۔ اور گہری بات یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام، زمین کی تہوں سے لے کر بعید ترین سیاروں تک، ایک ہمہ گیر قانون پر چل رہا ہے۔ یہ ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتا اگر اس کی بے شمار مختلف قوتوں اور بے حد و حساب چیزوں کے درمیان تناسب اور توازن اور ہم آہنگی اور تعاون نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی اٹل اور غالب و قاہر ضابطہ ان بے شمار اشیا اور قوتوں کو پوری مناسبت کے ساتھ باہم کام کرتے رہنے پر مجبور کر رہا ہو۔ اب یہ کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے مطلق العنان فرمانرواؤں کی حکومت میں ایک ضابطہ اس باقاعدگی کے ساتھ چل سکے۔ نظم کا وجود خود ہی ناظم کی وحدت کو مستلزم ہے۔ قانون اور ضابطہ کی ہمہ گیری آپ ہی اس بات پر شاہد ہے کہ اختیارات ایک ہی حاکمیت میں مرکوز ہیں اور وہ حاکمیت مختلف حاکموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔

پس پاک ہے اللہ رب العرش[۲۳] اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے)، جواب دِہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔
کیا اُسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے محمدؐ، ان سے کہو کہ "لاؤ اپنی دلیل، یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دَور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی[۲۴]"۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں[۲۵]۔ ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اُس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم میری ہی بندگی کرو۔
یہ کہتے ہیں رحمٰن اولاد رکھتا ہے[۲۶]۔ سبحان اللہ، وہ تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔ اُس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ اُن کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے

---

[۲۳] رب العرش، یعنی کائنات کے تختِ سلطنت کا مالک۔

[۲۴] پہلے دو استدلال عقلی تھے۔ اور یہ استدلال نقلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک جتنی کتابیں بھی خدا کی طرف سے دنیا کے کسی ملک میں کسی قوم کے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں، ان میں سے کسی میں یہ نکال کر دکھا دو کہ اللہ، خالقِ زمین و آسمان کے سوا کوئی دوسرا بھی خدائی کا کوئی شائبہ رکھتا ہے اور کسی اور کو بھی بندگی و عبادت کا حق پہنچتا ہے۔ پھر یہ کیسا مذہب تم لوگوں نے بنا رکھا ہے جس کی تائید میں نہ عقل سے کوئی دلیل ہے اور نہ آسمانی کتابیں ہی جس کے لیے کوئی شہادت فراہم کرتی ہیں۔

[۲۵] یعنی نبی کی بات پر ان کا توجہ نہ کرنا علم پر نہیں بلکہ جہل پر مبنی ہے۔ حقیقت سے بے خبر ہیں، اس لیے سمجھانے والے کی بات کو ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں۔

[۲۶] یہاں پھر فرشتوں ہی کا ذکر ہے جن کو مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ بعد کی تقریر سے یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے۔

رہتے ہیں[۲۷]۔ اور جو اُن میں سے کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں تو اُسے ہم جہنم کی سزا دیں، ہمارے ہاں ظالموں کا یہی بدلہ ہے ع

کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا[۲۸]، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی[۲۹]۔

[۲۷] مشرکین فرشتوں کو دو وجوہ سے معبود بناتے تھے۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک وہ خدا کی اولاد تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ ان کی پرستش (خوشامد) کر کے انہیں خدا کے ہاں اپنا شفیع (سفارشی) بنانا چاہتے تھے۔ (یقولون هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس۔ رکوع ۲) اور مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر۔ رکوع ۱)۔ ان آیات میں دونوں وجوہ کی تردید کر دی گئی ہے۔

اس جگہ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن بالعموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جنہیں تم شفیع قرار دیتے ہو وہ علمِ غیب نہیں رکھتے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اُن باتوں کو بھی جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہیں اور اُن باتوں کو بھی جو اُن سے اوجھل ہیں۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ آخر ان کو سفارش کرنے کا مطلق اور غیر مشروط اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہر شخص کے اگلے پچھلے اور پوشیدہ و ظاہر حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء و صالحین، ہر ایک کا اختیارِ شفاعت لازماً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے۔ بطورِ خود ہر کس و ناکس کی شفاعت کر دینے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ اور جب شفاعت سننا یا نہ سننا اور اسے قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اللہ کی مرضی پر موقوف ہے تو ایسے بے اختیار شفیع اس قابل کب ہو سکتے ہیں کہ ان کے آگے سرِ نیاز جھکایا جائے اور دستِ سوال دراز کیا جائے۔

[۲۸] اصل میں "رَتْق" اور "فَتْق" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رَتْق کے معنی ہیں یکجا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا۔ اور فَتْق کے معنی پھاڑنے اور جُدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے (MASS) کی سی تھی، بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اجرامِ فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنا دیے گئے۔

کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے[۳۰]، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں[۳۱]، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں[۳۲]۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا[۳۳]، مگر یہ ہیں کہ اس کی نشانیوں کی طرف[۳۴] توجہ ہی نہیں کرتے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں[۳۵]۔

۲۹؎ اس سے جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ پانی کو خدا نے سببِ زندگی اور اصلِ حیات بنایا، اسی میں اور اسی سے زندگی کا آغاز کیا۔ دوسری جگہ اس مطلب کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ (النور۔ رکوع ۶) "اور خدا نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا"۔

۳۰؎ اس کی تشریح سورۂ نحل میں گزر چکی ہے، ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۲۔

۳۱؎ یعنی پہاڑوں کے درمیان ایسے درے رکھ دیے اور دریا نکال دیے جن کی وجہ سے پہاڑی علاقوں سے گزرنے اور زمین کے ایک خطے سے دوسرے خطے کی طرف عبور کرنے کے راستے نکل آتے ہیں۔ اسی طرح زمین کے دوسرے حصوں کی ساخت بھی ایسی رکھی ہے کہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچنے کے لیے راہ بن جاتی ہے یا بنالی جاسکتی ہے۔

۳۲؎ ذو معنی فقرہ ہے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ لوگ زمین میں چلنے کے لیے راہ پائیں، اور یہ بھی کہ وہ اس حکمت اور اس کاریگری اور اس انتظام کو دیکھ کر حقیقت تک پہنچنے کا راستہ پالیں۔

۳۳؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ الحجر، حواشی نمبر ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲۔

۳۴؎ یعنی اُن نشانیوں کی طرف جو آسمان میں ہیں۔

۳۵؎ کُلٌّ اور یَسْبَحُوْنَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ مراد صرف سورج اور چاند ہی نہیں ہیں بلکہ دوسرے اَجرامِ فلکی یعنی تارے بھی مراد ہیں، ورنہ جمع کے بجائے تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔ فلک جو فارسی کے چرخ اور گردوں کا ٹھیک ہم معنی ہے، عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے "یہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں" سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سب تارے ایک ہی "فلک" میں نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کا فلک الگ ہے۔ دوسرے یہ کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ تارے کھونٹیوں کی طرح جڑے ہوئے

اور اے محمدؐ، ہمیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے نہیں رکھی ہے، اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے[۳۷]، اور ہم اچھے اور برے

ہوں اور وہ خود انہیں لیے ہوئے گھوم رہا ہو، بلکہ وہ کوئی سیال شے ہے یا فضا اور خلا کی سی نوعیت کی چیز ہے جس میں ان تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔

قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان و زمین کے رتق و فتق، اور پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے، اور تاروں کے ایک ایک فلک میں تیرنے کا مفہوم کچھ اور تھا، موجودہ زمانے میں طبعیات (PHYSICS) حیاتیات (BIOLOGY) اور علم ہیئت (ASTRONOMY) کی جدید معلومات نے ہمارے لیے ان کا مفہوم کچھ اور کر دیا ہے۔ اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ان الفاظ کے کن معانی پر روشنی ڈالیں گی۔ بہرحال موجودہ زمانے کا انسان ان تینوں آیات کو بالکل اپنی جدید ترین معلومات کے مطابق پاتا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ وَلَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے لے کر کَذٰلِکَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ تک کی تقریر شرک کی تردید میں ہے، اور اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا سے لے کر فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ تک جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں توحید کے لیے ایجابی (POSITIVE) دلائل دیئے گئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ یہ نظام کائنات جو تمہارے سامنے ہے، کیا اس میں کہیں ایک اللہ رب العٰلمین کے سوا کسی اور کی بھی کوئی کاریگری تمہیں نظر آتی ہے؟ کیا یہ نظام ایک سے زیادہ خداؤں کی کارفرمائی میں بن سکتا تھا اور اس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا تھا؟ کیا اس حکیمانہ نظام کے متعلق کوئی صاحبِ عقل و خرد آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے اور اس نے محض تفریح کے لیے چند گڑیاں بنائی ہیں جن سے کچھ مدت کھیل کر بس وہ یونہی ان کو خاک میں ملا دے گا؟ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور پھر بھی نبی کی بات ماننے سے انکار کیے جاتے ہو؟ تم کو نظر نہیں آتا کہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز اُس نظریۂ توحید کی شہادت دے رہی ہے جو یہ نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے؟

[۳۶] یہاں سے پھر سلسلۂ تقریر اس کشمکش کی طرف مڑتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخالفین کے درمیان برپا تھی

حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔[۳۸] آخر کار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔
یہ منکرینِ حق جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں "کیا یہ ہے وہ شخص جو تمہارے
خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے؟"[۳۹] اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ رحمان کے ذکر سے منکر ہیں۔[۴۰]

---

[۳۷] یہ مختصر جواب ہے اُن ساری دھمکیوں اور بددعاؤں اور کوسنوں اور قتل کی سازشوں کا جن سے ہر وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کی جاتی تھی۔ ایک طرف اکابر قریش تھے جو آئے دن آپ کو اس تبلیغ کے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے، اور ان میں سے بعض پر جوش مخالفین بیٹھ بیٹھ کر یہ تک سوچا کرتے تھے کہ کسی طرح آپ کا کام تمام کر دیں۔ دوسری طرف ہر وہ گھر جس کا کوئی فرد اسلام قبول کر لیتا تھا، آپ کا دشمن بن جاتا تھا۔ اس کی عورتیں آپ کو کلپ کلپ کر کوستی اور بددعائیں دیتی تھیں اور اس کے مرد آپ کو ڈراوے دیتے پھرتے تھے۔ خصوصاً ہجرتِ حبشہ کے بعد تو مکے بھر کے گھروں میں کہرام مچ گیا تھا، کیونکہ مشکل ہی سے کوئی ایسا گھرانا بچا رہ گیا تھا جس کے کسی لڑکے یا لڑکی نے ہجرت نہ کی ہو۔ یہ سب لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی دہائیاں دیتے تھے کہ اس شخص نے ہمارے گھر برباد کیے ہیں۔ انہی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ تم ان کی پروا کیے بغیر، بے خوف اپنا کام کیے جاؤ۔

[۳۸] یعنی راحت اور رنج، مفلسی اور امیری، غلبہ اور مغلوبی، قوت اور ضعف، صحت اور بیماری، غرض تمام مختلف حالات میں تم لوگوں کی آزمائش کی جا رہی ہے، تاکہ دیکھیں تم اچھے حالات میں متکبر، ظالم، خدا فراموش، بندۂ نفس تو نہیں بن جاتے، اور بُرے حالات میں کم ہمتی کے ساتھ پست اور ذلیل طریقے اور ناجائز راستے تو اختیار نہیں کرنے لگتے۔ لہٰذا کسی صاحبِ عقل آدمی کو ان مختلف حالات کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ جو حالت بھی اسے پیش آئے، اُس کے امتحانی اور آزمائشی پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے اور اس سے بخیریت گزرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صرف ایک احمق اور کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ جب اچھے حالات آئیں تو فرعون بن جائے، اور جب بُرے حالات پیش آ جائیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے۔

[۳۹] یعنی برائی کے ساتھ اُن کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ فقرہ اُن کے مذاق کا مضمون نہیں بتا رہا ہے، بلکہ مذاق اڑانے کی وجہ اور بنیاد پر روشنی ڈال رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ بجائے خود کوئی

انسان جلد باز مخلوق ہے[۴۲]۔ ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں، جلدی نہ مچاؤ[۴۳]۔
یہ لوگ کہتے ہیں "آخر یہ دھمکی پوری کب ہوگی اگر تم سچے ہو؟" کاش ان کافروں کو اُس وقت کا کچھ
علم ہوتا جبکہ یہ نہ اپنے منہ آگ سے بچا سکیں گے نہ اپنی پیٹھیں، اور نہ کہیں سے ان کو مدد پہنچے گی۔
وہ بلا اچانک آئے گی اور انہیں اس طرح یک لخت دبوچ لے گی کہ یہ نہ اُس کو دفع کر سکیں گے اور

مذاق کا فقرہ نہیں ہے۔ مذاق تو وہ دوسرے ہی الفاظ میں اڑاتے ہونگے اور کچھ اور ہی طرح کے آوازے کستے اور فقرے چست کرتے ہونگے۔ البتہ یہ سارا دل کا بخار جس وجہ سے نکالا جاتا تھا وہ یہ تھی کہ آپ ان کے خود ساختہ معبودوں کی خدائی کا رد کرتے تھے۔

[۴۱] یعنی بتوں اور بناوٹی خداؤں کی مخالفت تو انہیں اس قدر ناگوار ہے کہ اُس کا بدلہ لینے کے لیے تمہاری تضحیک و تذلیل کرتے ہیں، مگر انہیں خود اپنے حال پر شرم نہیں آتی کہ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کا ذکر سن کر آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔

[۴۲] اصل میں خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا لفظی ترجمہ ہے "انسان جلد بازی سے بنایا گیا، یا پیدا کیا گیا ہے"۔ لیکن یہ لفظی معنی اصل مقصودِ کلام نہیں ہیں۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص عقل کا پُتلا ہے، اور فلاں شخص حرفوں کا بنا ہُوا ہے، اُسی طرح عربی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں چیز سے پیدا کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز اُس کی سرشت میں ہے۔ یہی بات جس کو یہاں خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کہہ کر ادا کیا گیا ہے، دوسری جگہ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا، "انسان جلد باز واقع ہوا ہے" (بنی اسرائیل، رکوع ۲) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

[۴۳] بعد کی تقریر صاف بتا رہی ہے کہ یہاں "نشانیوں" سے کیا مراد ہے۔ وہ لوگ جن باتوں کا مذاق اڑاتے تھے اُن میں سے ایک عذابِ الٰہی، اور قیامت اور جہنم کا مضمون بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص آئے دن ہمیں ڈراوے دیتا ہے کہ میرا انکار کرو گے تو خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا، اور قیامت میں تم پر یہ بنے گی اور تم لوگ یوں جہنم کے ایندھن بنائے جاؤ گے۔ مگر ہم روز انکار کرتے ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی عذاب آتا دکھائی دے رہا ہے اور نہ کوئی قیامت ہی کہ ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ اسی کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

نہ ان کو لمحہ بھر مہلت ہی مل سکے گی۔ مذاق تم سے پہلے بھی رسولوں کا اڑایا جا چکا ہے، مگر اُن کا مذاق اڑانے والے اُسی چیز کے پھیر میں آکر رہے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ع

اَے محمدؐ، اِن سے کہو "کون ہے جو رات کو یا دن کو تمہیں رحمان سے بچا سکتا ہو؟" [۴۲] مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کی حمایت کریں؟ وہ تو نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری ہی تائید اُن کو حاصل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو اور اِن کے آبا و اجداد کو ہم زندگی کا سرو سامان دیئے چلے گئے یہاں تک کہ ان کو دن لگ گئے۔ [۴۳] مگر کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں؟ [۴۴] پھر کیا یہ غالب آجائیں گے؟ [۴۵] اِن سے کہہ دو کہ "مَیں تو وحی کی بنا پر تمہیں متنبہ کر رہا

---

[۴۲] یعنی اگر اچانک دن کو یا رات کو کسی وقت خدا کا زبردست ہاتھ تم پر پڑ جائے تو آخر وہ کونسا زور آور حامی و ناصر ہے جو اُس کی پکڑ سے تم کو بچا لے گا؟

[۴۳] یعنی ہماری اس مہربانی اور پرورش سے یہ اِس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کا کوئی ذاتی استحقاق ہے جس کا چھیننے والا کوئی نہیں۔ اپنی خوشحالیوں اور سرداریوں کو یہ لازوال سمجھنے لگے ہیں اور ایسے سرمست ہوگئے ہیں کہ انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔

[۴۴] یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ رعد میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۴۶۵ - ۴۶۶)۔ یہاں اس سیاق و سباق میں یہ ایک اور معنی بھی دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ زمین میں ہر طرف ایک غالب طاقت کی کارفرمائی کے یہ آثار نظر آتے ہیں کہ اچانک کبھی قحط کی شکل میں، کبھی وبا کی شکل میں، کبھی سیلاب کی شکل میں، کبھی زلزلے کی شکل میں، کبھی سردی یا گرمی کی شکل میں، اور کبھی کسی شکل میں، اور کبھی کسی اور شکل میں کوئی بلا ایسی آجاتی ہے جو انسان کے سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں۔ بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں غارت ہو جاتی ہیں۔ پیداوار گھٹ جاتی ہے۔ تجارتوں میں کساد بازاری آنے لگتی ہے۔ غرض انسان کے وسائلِ زندگی میں کبھی کسی طرف سے کمی

ہوں" ۔۔۔ مگر بہرے پکار کو نہیں سنا کرتے جبکہ انہیں خبردار کیا جائے۔ اور اگر تیرے رب کا عذاب ذرا سا انہیں چھو جائے[۴۷] تو ابھی چیخ اٹھیں کہ ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے۔

قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم سامنے لے آئیں گے۔ اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں[۴۸]۔

پہلے[۴۹] ہم موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور روشنی اور "ذِکر"[۵۰] عطا کر چکے ہیں اُن متقی لوگوں کی بھلائی

واقع ہو جاتی ہے اور کبھی کسی طرف سے۔ اور انسان اپنا سارا زور لگا کر بھی ان نقصانات کو نہیں روک سکتا۔

[۴۶] یعنی جبکہ ان کے تمام وسائلِ زندگی ہمارے ہاتھ میں ہیں، جس چیز کو چاہیں گھٹا دیں اور جسے چاہیں روک لیں، تو کیا یہ اتنا بل بوتا رکھتے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں غالب آ جائیں اور ہماری پکڑ سے بچ نکلیں؟ کیا یہ آثار ان کو یہی اطمینان دلا رہے ہیں کہ تمہاری طاقت لازوال اور تمہارا عیش غیرفانی ہے اور کوئی تمہیں پکڑنے والا نہیں ہے؟

[۴۷] وہی عذاب جس کے لیے یہ جلدی مچاتے ہیں اور مذاق کے انداز میں کہتے ہیں کہ لاؤ نا وہ عذاب، کیوں نہیں وہ ٹوٹ پڑتا۔

[۴۸] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۹۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس ترازو کی نوعیت کیا ہوگی۔ بہرحال وہ کوئی ایسی چیز ہوگی جو مادی چیزوں کو تولنے کے بجائے انسان کے اخلاقی اوصاف و اعمال اور اس کی نیکی و بدی کو تولے گی اور ٹھیک ٹھیک وزن کر کے بتا دے گی کہ اخلاقی حیثیت سے کس شخص کا کیا پایہ ہے ۔۔۔ نیک ہے تو کتنا نیک ہے اور بد ہے تو کتنا بد۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہماری زبان کے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر "ترازو" کا لفظ یا تو اس وجہ سے انتخاب فرمایا ہے کہ اس کی نوعیت ترازو سے اشبہ ہوگی، یا اس انتخاب کا مقصد یہ تصور دلانا ہے کہ جس طرح ایک ترازو کے پلڑے دو چیزوں کے وزن کا فرق ٹھیک ٹھیک بتا دیتے ہیں، اسی طرح ہماری میزانِ عدل بھی ہر انسان کے کارنامۂ زندگی کو جانچ کر بے کم و کاست بتا دے گی کہ اس میں نیکی کا پہلو غالب ہے یا بدی کا۔

[۴۹] یہاں سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر شروع ہوتا ہے اور پے در پے بہت سے انبیاء کی زندگی کے واقعات

کے لیے ۵۱ جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں اور جن کو (حساب کی) اس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو۔ ۵۲ اور
ع اب یہ بابرکت "ذکر" ہم نے (تمہارے لیے) نازل کیا ہے۔ پھر کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو؟ ع
اُس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے ۔ ۵۳

کی طرف مفصل یا مختصر اشارے کیے جاتے ہیں۔ یہ ذکر جس سیاق و سباق میں آیا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حسب ذیل باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:۔

اوّل یہ کہ تمام پچھلے انبیاء بھی بشر ہی تھے، کوئی نرالی مخلوق نہ تھے۔ تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ آج پہلی مرتبہ ہی پیش نہیں آیا ہے کہ ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

دوم یہ کہ پہلے انبیاء بھی اسی کام کے لیے آئے تھے جو کام اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔ یہی اُن کا مشن تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی۔

سوم یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ رہا ہے۔ بڑے بڑے مصائب سے وہ گزرے ہیں، سالہا سال مصائب میں مبتلا رہے ہیں، شخصی اور ذاتی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈالے ہوئے مصائب میں بھی۔ مگر آخر کار اللہ کی نصرت و تائید اُن کو حاصل ہوئی ہے، اس نے اپنے فضل و رحمت سے اُن کو نوازا ہے، ان کی دعاؤں کو قبول کیا ہے، ان کی تکلیفوں کو رفع کیا ہے، ان کے مخالفوں کو نیچا دکھایا ہے، اور معجزانہ طریقوں پر ان کی مدد کی ہے۔

چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبولِ بارگاہ ہونے کے باوجود، اور اس کی طرف سے بڑی بڑی حیرت انگیز طاقتیں پانے کے باوجود تھے وہ بندے اور بشر ہی۔ الوہیت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی۔ رائے اور فیصلے کی غلطی بھی کرتے تھے۔ بیمار بھی ہوتے تھے۔ آزمائشوں میں بھی ڈالے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ قصور بھی ان سے ہو جاتے تھے اور انہیں سزا تک دے دی جاتی تھی۔

۵۰ ؎ تینوں الفاظ توراۃ کی تعریف میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی وہ حق و باطل کا فرق دکھانے والی کسوٹی تھی، وہ انسان کو زندگی کا سیدھا راستہ دکھانے والی روشنی تھی، اور وہ اولادِ آدم کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والی نصیحت تھی۔

یاد کرو وہ موقع ۵۶ جبکہ اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ "یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ

۵۳ یعنی اگرچہ بھیجی گئی تھی وہ تمام انسانوں کے لیے، مگر اس سے فائدہ عملاً وہی لوگ اُٹھا سکتے تھے جو ان صفات سے متصف ہوں۔

۵۴ جس کا ابھی اوپر ذکر گزرا ہے، یعنی قیامت۔

۵۵ "ہوشمندی" ہم نے "رُشد" کا ترجمہ کیا ہے جس کے معنی ہیں "صحیح و غلط میں تمیز کر کے صحیح بات یا طریقے کو اختیار کرنا اور غلط بات یا طریقے سے احتراز کرنا"۔ اس مفہوم کے لحاظ سے "رُشد" کا ترجمہ "راست روی" بھی ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ رُشد کا لفظ محض راست روی کو نہیں بلکہ اُس راست روی کو ظاہر کرتا ہے جو نتیجہ ہو فکرِ صحیح اور عقلِ سلیم کا، اس لیے ہم نے "ہوشمندی" کے لفظ کو اُس کے مفہوم سے اقرب سمجھا ہے۔

"ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی"، یعنی جو ہوشمندی اس کو حاصل تھی وہ ہماری عطا کردہ تھی۔

"ہم اس کو خوب جانتے تھے"، یعنی ہماری یہ بخشش کوئی اندھی بانٹ نہ تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے، اس لیے ہم نے اس کو نوازا۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ، "اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کے حوالے کرے" (الانعام، رکوع ۱۵)۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے سردارانِ قریش کے اُس اعتراض کی طرف جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آخر اس شخص میں کونسے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ اللہ ہم کو چھوڑ کر اسے رسالت کے منصب پر مقرر کرے۔ اس کا جواب مختلف مقامات پر قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنے لطیف اشارے پر اکتفا کیا گیا کہ یہی سوال ابراہیم کے متعلق بھی ہو سکتا تھا، پوچھا جا سکتا تھا کہ سارے ملکِ عراق میں ایک ابراہیم ہی کیوں اس نعمت سے نوازا گیا، مگر ہم جانتے تھے کہ ابراہیم میں کیا اہلیت ہے، اس لیے اُن کی پوری قوم میں سے اُن کو اس نعمت کے لیے منتخب کیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرتِ پاک کے مختلف پہلو اس سے پہلے سورۂ بقرہ، انعام، توبہ، ہود، ابراہیم، حجر اور نحل میں گزر چکے ہیں جن پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہو گا (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۰۸ تا ۱۱۴۔ ۱۹۷ تا ۱۹۹۔ ۲۰۱۔ ۵۵۲ تا ۵۶۰۔ جلد دوم صفحہ ۲۴۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۶ تا ۳۸۸۔ ۴۸۴ تا ۴۹۱۔ ۵۰۹ تا ۵۱۱۔ ۵۸۰)

۵۶ جس واقعہ کا آگے ذکر کیا جا رہا ہے اُس کو پڑھنے سے پہلے یہ بات اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ قریش

گرویدہ ہو رہے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔" اس نے کہا "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔" انہوں نے کہا "کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟"۵۵ اُس نے جواب دیا "نہیں، بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔ اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔"۵۶ چنانچہ اُس نے اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۵۷ اور صرف اُن کے بڑے بُت کو

کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے، کعبہ انہی کا تعمیر کردہ تھا، سارے عرب میں کعبے کی مرکزیت انہی کی نسبت کے سبب سے تھی اور قریش کا سارا بھرم اسی لیے بندھا ہوا تھا کہ یہ اولادِ ابراہیمؑ ہیں اور کعبۂ ابراہیمی کے مجاور ہیں۔ آج اس زمانے اور عرب سے دور دراز کے ماحول میں تو حضرت ابراہیمؑ کا یہ قصہ صرف ایک سبق آموز تاریخی واقعہ ہی نظر آتا ہے، مگر جس زمانے اور ماحول میں اول اول یہ بیان کیا گیا تھا، اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ قریش کے مذہب اور ان کی برہمنیت پر یہ ایک ایسی کاری ضرب تھی جو ٹھیک اُس کی جڑ پر جا کر لگتی تھی۔

۵۵ اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "کیا تو ہمارے سامنے حق پیش کر رہا ہے یا کھیلتا ہے؟" لیکن اصل مفہوم وہی ہے جس کی ترجمانی اوپر کی گئی ہے۔ اُن لوگوں کو اپنے دین کے برحق ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ یہ تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ یہ باتیں کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ تم مذاق اور کھیل کر رہے ہو یا واقعی تمہارے یہی خیالات ہیں۔

۵۶ یعنی اگر تم استدلال سے بات نہیں سمجھتے ہو تو میں عملاً تمہیں مشاہدہ کرا دوں گا کہ یہ بے بس ہیں، ان کے پاس کچھ بھی اختیارات نہیں ہیں، اور ان کو خدا بنانا غلط ہے۔ رہی یہ بات کہ عملی تجربے اور مشاہدے سے یہ بات وہ کس طرح ثابت کریں گے، تو اس کی کوئی تفصیل حضرت ابراہیمؑ نے اُس موقع پر نہیں بتائی۔

۵۷ یعنی موقع پا کر جب کہ پجاری اور مجاور موجود نہ تھے، حضرت ابراہیمؑ ان کے مرکزی بت خانے میں گھس گئے اور سارے بتوں کو توڑ ڈالا۔

چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں[۵۸]۔ (انہوں نے آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے "یہ ہمارے خداؤں کا حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ۔" (بعض لوگ) بولے "ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے۔" انہوں نے کہا "تو پکڑ لاؤ اُسے سب کے سامنے تاکہ لوگ دیکھ لیں (اُس کی کیسی خبر لی جاتی ہے)[۵۹]۔" (ابراہیم کے آنے پر) انہوں نے پوچھا "کیوں ابراہیم، تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟" اُس نے جواب دیا "بلکہ یہ سب کچھ ان کے سردار نے کیا ہے، ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں[۶۰]۔" یہ سُن کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف

[۵۸] "اُس کی طرف" کا اشارہ بڑے بُت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابراہیم کی طرف بھی۔ اگر پہلی بات ہو تو یہ حضرت ابراہیم کی طرف سے اُن کے عقائد پر ایک طنز کا ہم معنی ہے۔ یعنی اگر ان کے نزدیک واقعی یہ خدا ہیں تو انہیں اپنے بڑے خدا کے متعلق یہ شبہ ہونا چاہیے کہ شاید بڑے حضرت ان چھوٹے حضرتوں سے کسی بات پر بگڑ گئے ہوں اور سب کا کچومر بنا ڈالا ہو۔ اور اگر دوسرا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت ابراہیم کا منشا اس کارروائی سے یہ تھا کہ اپنے بتوں کا یہ حال دیکھ کر شاید ان کا ذہن میری ہی طرف منتقل ہوگا اور یہ مجھ سے پوچھیں گے تو مجھ کو پھر ان سے صاف صاف بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔

[۵۹] یہ گویا حضرت ابراہیم کی منہ مانگی مراد تھی، کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ بات صرف پروہتوں اور پجاریوں ہی کے سامنے نہ ہو بلکہ عام لوگ بھی موجود ہوں اور سب دیکھ لیں کہ یہ بت جو اُن کے قاضی الحاجات بنا کر رکھے گئے ہیں کیسے بے بس ہیں اور خود یہ پروہت حضرات ان کو کیا سمجھتے ہیں۔ اس طرح ان پجاریوں سے بھی وہی حماقت سرزد ہوئی جو فرعون سے سرزد ہوئی تھی۔ اُس نے بھی جادوگروں سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک بھر کی خلقت جمع کرائی تھی اور انہوں نے بھی حضرت ابراہیم کا مقدمہ سننے کے لیے عوام کو اکٹھا کر لیا۔ وہاں حضرت موسیٰ کو سب کے سامنے یہ ثابت کرنے کا موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ لائے ہیں وہ جادو نہیں معجزہ ہے۔ اور یہاں حضرت ابراہیم کو ان کے دشمنوں نے آپ ہی یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ عوام کے سامنے اُن کے مکروفریب کا طلسم توڑ دیں۔

[۶۰] یہ آخری فقرہ خود ظاہر کر رہا ہے کہ پہلے فقرے میں حضرت ابراہیم نے بُت شکنی کے اس فعل کو بڑے

بت کی طرف جو منسوب کیا ہے اس سے ان کا مقصد جھوٹ بولنا نہ تھا، بلکہ وہ اپنے مخالفین پر حجت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی تھی کہ وہ لوگ جواب میں خود اس کا اقرار کریں کہ ان کے یہ معبود بالکل بے بس ہیں اور اُن سے کسی فعل کی توقع تک نہیں کی جاسکتی ہے۔ ایسے مواقع پر ایک شخص استدلال کی خاطر جو خلافِ واقعہ بات کہتا ہے اُس کو جھوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ نہ وہ خود جھوٹ کی نیت سے ایسی بات کہتا ہے اور نہ اس کے مخاطب ہی اسے جھوٹ سمجھتے ہیں۔ کہنے والا اسے حجت قائم کرنے کے لیے کہتا ہے اور سننے والا بھی اُسے اِسی معنی میں لیتا ہے۔

بدقسمتی سے حدیث کی ایک روایت میں یہ بات آگئی ہے کہ حضرت ابراہیم اپنی زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں۔ ان میں سے ایک "جھوٹ" تو یہ ہے، اور دوسرا "جھوٹ" سورۂ صافات میں حضرت ابراہیم کا قول اِنِّی سَقِیْمٌ ہے، اور تیسرا "جھوٹ" اُن کا اپنی بیوی کو بہن کہنا ہے جس کا ذکر قرآن میں نہیں بلکہ بائیبل کی کتاب پیدائش میں آیا ہے۔ ایک گروہ روایت پرستی میں غلو کرکے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ اس ایک روایت کو لے کر پورے ذخیرۂ حدیث پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ساری ہی حدیثوں کو اٹھا کر پھینک دو کیونکہ ان میں ایسی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ نہ ایک یا چند روایات میں کسی خرابی کے پائے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری ہی روایات ناقابلِ اعتماد ہوں۔ اور نہ فنِ حدیث کے نقطۂ نظر سے کسی روایت کی سند کا مضبوط ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابلِ اعتراض ہو مگر اسے ضرور آنکھیں بند کرکے مان لیا جائے۔ سند کے قوی اور قابلِ اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے اسباب ایسے ہوسکتے ہیں جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہوجاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے سند کے ساتھ متن کو دیکھنا بھی ضروری ہے، اور اگر متن میں واقعی کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث، جس میں حضرت ابراہیم کے تین "جھوٹ" بیان کیے گئے ہیں، صرف اسی وجہ سے قابلِ اعتراض

پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے "واقعی تم خود ہی ظالم ہو"۔ مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی[۶۱] اور بولے

نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے۔ بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محلِ نظر ہیں۔ اُن میں سے ایک "جھوٹ" کا حال ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل و خرد کا آدمی بھی اس سیاق و سباق میں حضرت ابراہیم کے اس قول پر لفظ "جھوٹ" کا اطلاق نہیں کر سکتا، کجا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ اللہ اس سخن ناشناسی کی توقع کریں۔ رہا اِنّی سَقِیْمٌ والا واقعہ تو اس کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیم فی الواقع اُس وقت بالکل صحیح و تندرست تھے اور کوئی ادنیٰ سی شکایت بھی اُن کو نہ تھی۔ یہ بات نہ قرآن میں کہیں بیان ہوئی ہے اور نہ اس زیرِ بحث روایت کے سوا کسی دوسری معتبر روایت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اب رہ جاتا ہے بیوی کو بہن قرار دینے کا واقعہ، تو وہ بجائے خود ایسا مہمل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ اُس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیم اپنی بیوی حضرت سارہ کے ساتھ مصر گئے ہیں۔ بائیبل کی رُو سے اُس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۷۵ اور حضرت سارہ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور اس عمر میں حضرت ابراہیم کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ شاہِ مصر اس خوبصورت خاتون کو حاصل کرنے کی خاطر مجھے قتل کر دے گا۔ چنانچہ وہ بیوی سے کہتے ہیں کہ جب مصری تمہیں پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جانے لگیں تو تم بھی مجھے اپنا بھائی بتانا اور میں بھی تمہیں اپنی بہن بتاؤں گا تاکہ میری جان تو بچ جائے (پیدائش، باب ۱۲)۔ حدیث کی زیرِ بحث روایت میں تیسرے "جھوٹ" کی بنیاد اسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلی روایت پر ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو اس کو بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر صرف اس لیے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟ اِسی طرح کی اِفراط پسندیاں پھر معاملے کو بگاڑ کر اُس تفریط تک نوبت پہنچا دیتی ہیں جس کا مظاہرہ منکرینِ حدیث کر رہے ہیں۔

[۶۱] اصل میں نُکِسُوْا عَلٰی رُءُوْسِہِمْ (اوندھا دیئے گئے اپنے سروں کے بل) فرمایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ انہوں نے خجالت کے مارے سر جھکا لیے۔ لیکن موقع و محل اور اسلوبِ بیان اس معنی کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ صحیح مطلب، جو سلسلۂ کلام اور اندازِ کلام پر نظر کرنے سے صاف سمجھ میں

"تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں"۔ ابراہیم نے کہا "پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پُوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تُف ہے تم پر اور تمہارے ان معبُودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پُوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے"؟ انہوں نے کہا "جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے"۔ ہم نے کہا "اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر"۔[۶۲] وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا۔

آ جاتا ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا جواب سنتے ہی پہلے تو انہوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ واقعی ظالم تو تم خود ہو، کیسے بے بس اور بے اختیار معبودوں کو خدا بنائے بیٹھے ہو جو اپنی زبان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان پر کیا بیتی اور کون انہیں مار گیا، آخر یہ ہماری کیا مدد کریں گے جب کہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے۔ لیکن اس کے بعد فوراً ہی ان پر ضد اور جہالت سوار ہو گئی اور جیسا کہ ضد کا خاصہ ہے، اس کے سوار ہوتے ہی ان کی عقل اوندھ گئی۔ دماغ سیدھا سوچتے سوچتے یکایک الٹا سوچنے لگا۔

[۶۲] الفاظ صاف بتا رہے ہیں، اور سیاق و سباق بھی اس مفہوم کی تائید کر رہا ہے، کہ انہوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا، اور جب آگ کا الاؤ تیار کر کے انہوں نے حضرت ابراہیم کو اس میں پھینکا تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم کے لیے ٹھنڈی ہو جائے اور بے ضرر بن کر رہ جائے۔ پس صریح طور پر یہ بھی اُن معجزات میں سے ایک ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان معجزات کی اس لیے تاویلیں کرتا ہے کہ اُس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظام عالم کے معمول (ROUTINE) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے، تو آخر وہ خدا کو ماننے ہی کی زحمت کیوں اٹھاتا ہے۔ اور اگر اس طرح کی تاویلیں وہ اس لیے کرتا ہے کہ جدید زمانے کے نام نہاد عقلیت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ بندۂ خدا، تیرے اوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تو کسی نہ کسی طرح انہیں منوا کر ہی چھوڑ؟ جو شخص قرآن کو، جیسا کہ وہ ہے، ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا، جبکہ قرآن کے الفاظ قدم قدم پر اس ڈھلائی کی مزاحمت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغ ہے اور کون معقول آدمی اسے جائز سمجھ سکتا ہے۔

اور ہم اُسے اور لوط کو[۶۳] بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں[۶۴]۔ اور ہم نے اسے اسحٰق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید[۶۵]، اور سب کو صالح بنایا۔ اور ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔ اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی، اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے[۶۶]۔

۶۳ بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے دو بھائی تھے، نحور اور حاران۔ حضرت لوط حاران کے بیٹے تھے (پیدائش باب ۱۱، آیت ۲۶)۔ سورۂ عنکبوت میں حضرت ابراہیم کا جو تذکرہ آیا ہے اُس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوط ہی ان پر ایمان لائے تھے (ملاحظہ ہو رکوع ۳)

۶۴ یعنی شام و فلسطین کی سرزمین۔ اس کی برکتیں مادی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ مادی حیثیت سے وہ دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں سے ہے۔ اور روحانی حیثیت سے وہ ۲ ہزار برس تک انبیاء علیہم السلام کا مہبط رہی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے خطے میں اتنی کثرت سے انبیاء مبعوث نہیں ہوئے ہیں۔

۶۵ یعنی بیٹے کے بعد پوتا بھی ایسا ہوا جسے نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

۶۶ حضرت ابراہیم کی زندگی کے اس اہم واقعے کا بائیبل میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے عراقی دَور کا کوئی واقعہ بھی اس کتاب میں جگہ نہیں پا سکا ہے۔ نمرود سے ان کی مڈبھیڑ، باپ اور قوم سے ان کی کشمکش، بت پرستی کے خلاف ان کی جدوجہد، آگ میں ڈالے جانے کا قصہ، اور بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا، ان میں سے ہر چیز بائیبل کی کتاب "پیدائش" کے مصنف کی نگاہ میں ناقابلِ التفات تھی۔ وہ صرف ان کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے، مگر وہ بھی اس انداز سے کہ جیسے ایک خاندان تلاشِ معاش میں ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ قرآن اور بائیبل کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی رُو سے حضرت ابراہیم کا مشرک باپ ان پر ظلم کرنے میں پیش پیش تھا، اور بائیبل کہتی ہے کہ ان کا باپ خود اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کو لے کر حاران میں جا بسا (باب ۱۱۔ آیات ۲۷ تا ۳۲)۔ اس کے بعد یکایک خدا حضرت ابراہیم سے کہتا ہے کہ تو حاران کو چھوڑ کر کنعان میں جا کر بس جا اور "میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا، سو تو باعث برکت ہو، جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت

کرے اُس پر مَیں لعنت کرونگا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے" (باب ۱۲ آیت ۱تا۳) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک حضرت ابراہیم پر یہ نظرِ عنایت کیوں ہوگئی۔

تلمود میں البتہ سیرتِ ابراہیمی کے عراقی دور کی وہ بیشتر تفصیلات ملتی ہیں جو قرآن کے مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہیں، مگر دونوں کا تقابل کرنے سے نہ صرف یہ کہ قصے کے اہم اجزاء میں بیّن تفاوت نظر آتا ہے، بلکہ ایک شخص صریح طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تلمود کا بیان بکثرت بے جوڑ اور خلافِ قیاس باتوں سے بھرا ہوا ہے اور اس کے برعکس قرآن بالکل منقّح صورت میں حضرت ابراہیم کے اہم واقعاتِ زندگی کو پیش کرتا ہے جن میں کوئی لغو بات آنے نہیں پائی ہے۔ توضیحِ مدعا کے لیے ہم یہاں تلمود کی داستان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ اُن لوگوں کی غلطی پوری طرح کھل جائے جو قرآن کو بائیبل اور یہودی لٹریچر کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔

تلمود کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش کے روز نجومیوں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر نمرود کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تارح کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے اُسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ اُن کے قتل کے درپے ہوا۔ مگر تارح نے اپنے ایک غلام کا بچہ ان کے بدلے میں دے کر انہیں بچا لیا۔ اس کے بعد تارح نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں لے جا کر چھپا دیا جہاں ۱۰ سال تک وہ رہے۔ گیارہویں سال حضرت ابراہیم کو تارح نے حضرت نوح کے پاس پہنچا دیا اور ۳۹ سال تک وہ حضرت نوح اور ان کے بیٹے سام کی تربیت میں رہے۔ اسی زمانے میں حضرت ابراہیم نے اپنی سگی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا جو عمر میں ان سے ۴۲ سال چھوٹی تھیں (بائیبل اس کی تصریح نہیں کرتی کہ سارہ حضرت ابراہیم کی بھتیجی تھیں۔ نیز وہ دونوں کے درمیان عمر کا فرق بھی صرف ۱۰ سال بتاتی ہے۔ پیدائش باب ۱۱۔ آیت ۲۹۔ اور باب ۱۷۔ آیت ۱۷)

پھر تلمود کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم پچاس سال کی عمر میں حضرت نوح کا گھر چھوڑ کر اپنے باپ کے ہاں آگئے۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ باپ بت پرست ہے اور گھر میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے ۱۲ بت رکھے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، اور جب اس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو ایک روز موقع پا کر اس گھریلو بت خانے کو توڑ ڈالا۔ تارح نے آکر اپنے خداؤں کا یہ حال جو دیکھا تو سیدھا نمرود کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ۵۰ برس پہلے میرے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا تھا آج اس نے میرے گھر میں یہ حرکت کی ہے

آپ اس کا فیصلہ کیجیے۔ نمرود نے بلا کر حضرت ابراہیم سے باز پرس کی۔ انہوں نے سخت جوابات دیئے۔ نمرود نے اُن کو فوراً جیل بھیج دیا اور پھر معاملہ اپنی کونسل میں پیش کیا تاکہ صلاح مشورے سے اس مقدمے کا فیصلہ کیا جائے۔ کونسل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا ایک بڑا الاؤ تیار کرایا گیا اور حضرت ابراہیم اس میں پھینک دیے گئے۔ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کے بھائی اور خسر، حاران کو بھی پھینکا گیا، کیونکہ نمرود نے تارح سے جب پوچھا کہ تیرے اس بیٹے کو تو میں پیدائش ہی کے روز قتل کرنا چاہتا تھا، تو نے اس وقت اسے بچا کر دوسرا بچہ کیوں اس کے بدلے قتل کرایا؟ تو اس نے کہا کہ میں نے حاران کے کہنے سے یہ حرکت کی تھی۔ اس لیے خود اس فعل کے مرتکب کو تو چھوڑ دیا گیا اور مشورہ دینے والے کو حضرت ابراہیم کے ساتھ آگ میں پھینکا گیا۔ آگ میں گرتے ہی حاران فوراً جل بھن کر کوئلہ ہو گیا مگر حضرت ابراہیم کو لوگوں نے دیکھا کہ اندر اطمینان سے ٹہل رہے ہیں۔ نمرود کو اس معاملے کی اطلاع کی گئی۔ اس نے آکر جب خود اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ لیا تو پکار کر کہا کہ "آسمانی خدا کے بندے، آگ سے نکل آ اور میرے سامنے کھڑا ہو جا"۔ حضرت ابراہیم باہر آگئے۔ نمرود ان کا معتقد ہو گیا اور اس نے بہت سے قیمتی نذرانے ان کو دے کر رخصت کر دیا۔

اس کے بعد تلمود کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم دو سال تک وہاں رہے۔ پھر نمرود نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا اور اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ابراہیم تیری سلطنت کی تباہی کا موجب بنے گا، اسے قتل کرا دے۔ اُس نے قتل کے لیے آدمی بھیجے، مگر حضرت ابراہیم کو خود نمرود ہی کے عطا کیے ہوئے ایک غلام، الیعزر نے قبل از وقت اس منصوبے کی اطلاع دے دی اور حضرت ابراہیم نے بھاگ کر حضرت نوح کے ہاں پناہ لی۔ وہاں تارح آکر اُن سے خفیہ طور پر ملتا رہا اور آخر باپ بیٹوں کی یہ صلاح ہوئی کہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ حضرت نوح اور سام نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ تارح اپنے بیٹے ابراہیم اور پوتے لوط اور پوتی اور بہو سارہ کو لے کر اُر سے حاران چلا گیا۔ (منتخبات تلمود۔ از ایچ پولانو، لندن صفحہ ۳۰ تا ۴۲)

کیا اس داستان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ قرآن کا ماخذ ہو سکتی ہے؟

اور لوط کو ہم نے حکم اور علم بخشا[۶۷] اور اُسے اُس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بد کاریاں کرتی تھی ــ درحقیقت وہ بڑی ہی بُری، فاسق قوم تھی ــ اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں میں سے تھا۔ ع

اور یہی نعمت ہم نے نوح کو دی۔ یاد کرو جبکہ ان سب سے پہلے اُس نے ہمیں پکارا تھا۔[۶۸] ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے نجات دی[۶۹] اور اُس قوم کے مقابلے میں اُس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا تھا۔ وہ بڑے بُرے لوگ تھے۔ پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد و سلیمان کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں، اور ہم اُن کی عدالت کو خود دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا، حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔[۷۰]

---

۶۷ ؎ "حکم اور علم بخشنا" بالعموم قرآن مجید میں نبوت عطا کرنے کا ہم معنی ہوتا ہے۔ "حکم" سے مراد حکمت بھی ہے، صحیح قوتِ فیصلہ بھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سندِ حکمرانی یا (AUTHORITY) حاصل ہونا بھی۔ رہا "علم" تو اس سے مراد وہ علمِ حق ہے جو وحی کے ذریعہ عطا کیا گیا ہو۔ حضرت لوط کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد ۲۔ صفحہ ۵۱ تا ۵۳۔ ۲۱۳۔ ۲۵۳۔ ۲۵۵ تا ۲۵۹۔ ۳۶۲۔ ۴۸۹۔ ۵۱۱۔ ۵۱۵ تا ۵۱۵۔

۶۸ ؎ اشارہ ہے حضرت نوح کی اس دعا کی طرف جو ایک مدت دراز تک اپنی قوم کی اصلاح کے لیے ناکام کوشش کرتے رہنے کے بعد آخر کار تھک کر انہوں نے مانگی تھی کہ اِنِّی مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ، "پروردگار میں مغلوب ہو گیا ہوں اب میری مدد کو پہنچ" (القمر۔ رکوع ۱)۔ اور رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا "پروردگار زمین پر ایک کافر باشندہ بھی نہ چھوڑ" (نوح۔ رکوع ۲)

۶۹ ؎ کربِ عظیم سے مراد یا تو ایک بدکردار قوم کے درمیان زندگی بسر کرنے کی مصیبت ہے، یا پھر طوفان۔ حضرت نوح کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۰ تا ۴۴۔ ۲۹۹ تا ۳۰۱۔ ۳۴۳ تا ۳۴۴۔ ۵۹۱

ؔ اس واقعے کا کوئی ذکر بائیبل میں نہیں ہے، اور یہودی لٹریچر میں بھی ہمیں اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ مسلمان مفسرین نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص کے کھیت میں دوسرے شخص کی بکریاں رات کے وقت گھس گئی تھیں۔ اُس نے حضرت داؤد کے ہاں استغاثہ کیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اُس کی بکریاں چھین کر اسے دے دی جائیں۔ حضرت سلیمان نے اس سے اختلاف کیا اور یہ رائے دی کہ بکریاں اُس وقت تک کھیت والے کے پاس رہیں جب تک بکری والا اُس کے کھیت کو پھر سے تیار نہ کر دے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ فیصلہ ہم نے سلیمان کو سمجھایا تھا۔ مگر چونکہ مقدمے کی یہ تفصیل قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصریح نقل ہوئی ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کے مقدمے میں یہی بات ثابت شدہ اسلامی قانون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور دوسرے فقہائے اسلام کے درمیان اس امر میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ اگر کسی کا کھیت دوسرے شخص کے جانور خراب کر دیں تو کوئی تاوان عائد ہو گا یا نہیں اور عائد ہو گا تو کس صورت میں ہو گا، نیز یہ کہ تاوان کی شکل کیا ہو گی۔

اس سیاق و سباق میں حضرت داؤد و سلیمان کے اس خاص واقعے کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبی ہونے اور اللہ کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں اور قابلیتیں پانے کے باوجود ہوتے انسان ہی تھے، الوہیت کا کوئی شائبہ ان میں نہ ہوتا تھا۔ اس مقدمے میں حضرت داؤد کی رہنمائی وحی کے ذریعہ سے نہ کی گئی اور وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر گئے۔ حضرت سلیمان کی رہنمائی کی گئی اور انہوں نے صحیح فیصلہ کیا۔ حالانکہ نبی دونوں ہی تھے۔ آگے ان دونوں بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی یہی بات سمجھانے کے لیے ہے کہ یہ عطائی کمالات تھے اور اس طرح کے کمالات کسی کو خدا نہیں بنا دیتے۔ ضمناً اس آیت سے عدالت کا یہ اصول بھی معلوم ہوا کہ اگر دو جج ایک مقدمے کا فیصلہ کریں، اور دونوں کے فیصلے مختلف ہوں، تو اگرچہ صحیح فیصلہ ایک ہی کا ہو گا، لیکن دونوں برحق ہوں گے، بشرطیکہ عدالت کرنے کی ضروری استعداد دونوں میں موجود ہو، ان میں سے کوئی جہالت اور ناتجربہ کاری کے ساتھ عدالت کرنے نہ بیٹھ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اس بات کو اور زیادہ کھول کر

داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے،[الف] اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔ اور ہم نے اُس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی

بیان فرما دیا ہے۔ بخاری میں عمرو بن العاص کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا اذا اجتھد الحاکم فاصاب فلہ اجران واذا اجتھد فاخطأ فلہ اجرٌ "اگر حاکم اپنی حد تک حق فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کرے تو صحیح فیصلہ کرنے کی صورت میں اُس کے لیے دُہرا اجر ہے اور غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں اکہرا اجر۔" ابو داؤد اور ابن ماجہ میں بُرَیدہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "قاضی تین قسم کے ہیں، ایک ان میں سے جنتی ہے اور دو جہنمی۔ جنتی وہ قاضی ہے جو حق کو پہچان جائے تو اس کے مطابق فیصلہ دے۔ مگر جو شخص حق کو پہچاننے کے باوجود خلافِ حق فیصلہ دے تو وہ جہنمی ہے۔ اور اسی طرح وہ بھی جہنمی ہے جو علم کے بغیر لوگوں کے فیصلے کرنے کے لیے بیٹھ جائے۔"

[الف] مَعَ دَاوٗدَ کے الفاظ ہیں، لِدَاوٗدَ کے الفاظ نہیں ہیں، یعنی "داؤد علیہ السلام کے لیے" نہیں بلکہ "ان کے ساتھ" پہاڑ اور پرندے مسخر کیے گئے تھے، اور اس تسخیر کا حاصل یہ تھا کہ وہ بھی حضرتِ ممدوح کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرتے تھے۔ یہی بات سورۂ ص میں بیان کی گئی ہے، اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗ اَوَّابٌ "ہم نے اُس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام تسبیح کرتے تھے، اور پرندے بھی مسخر کر دیے تھے جو اکٹھے ہو جاتے تھے، سب اُس کی تسبیح دہراتے تھے۔" سورۂ سبا میں اس کی مزید وضاحت یہ ملتی ہے یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ "پہاڑوں کو ہم نے حکم دیا کہ اُس کے ساتھ تسبیح دہراؤ، اور یہی حکم پرندوں کو دیا۔" ان ارشادات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد جب اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گاتے تھے تو ان کی بلند اور سریلی آواز سے پہاڑ گونج اُٹھتے تھے، پرندے ٹھیر جاتے تھے اور ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ اس معنی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو غیر معمولی طور پر خوش آواز بزرگ تھے، قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اِدھر سے گذرے تو ان کی آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور دیر تک سنتے رہے۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا لقد اوتی مزمارا من مزامیر اٰل داؤد، یعنی اس شخص

تھی، تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے[۷۲]، پھر کیا تم شکرگزار ہو؟[۷۳] اور سلیمان کے لیے ہم نے

کو داؤد کی خوش آوازی کا ایک حصہ ملا ہے۔

[۷۲] سورۂ سبا میں مزید تفصیل یہ ہے: وَاَلَنَّا لَہُ الْحَدِيْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ "اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا (اور اس کو ہدایت کی) کہ پوری پوری زرہیں بنا اور ٹھیک اندازے سے کڑیاں جوڑ۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو لوہے کے استعمال پر قدرت عطا کی تھی، اور خاص طور پر جنگی اغراض کے لیے زرہ سازی کا طریقہ سکھایا تھا۔ موجودہ زمانے کی تاریخی و اثری تحقیقات سے ان آیات کے معنی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں لوہے کے استعمال کا دور (IRON AGE) ۱۲۰۰ اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیان شروع ہوا ہے، اور یہی حضرت داؤد کا زمانہ ہے۔ اوّل اوّل شام اور ایشیائے کوچک کی حِتّی قوم (Hittites) کو لوہے کے پگھلانے اور تیار کرنے کا ایک پیچیدہ طریقہ معلوم ہوا اور وہ شدت کے ساتھ اس کو دنیا بھر سے راز میں رکھے رہی۔ مگر اس طریقے سے جو لوہا تیار ہوتا تھا وہ سونے چاندی کی طرح اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ عام استعمال میں نہ آسکتا تھا۔ بعد میں فِلستیوں نے یہ طریقہ معلوم کر لیا، اور وہ بھی اسے راز ہی میں رکھتے رہے۔ طالوت کی بادشاہی سے پہلے حِتّیوں اور فِلستیوں نے بنی اسرائیل کو پیہم شکستیں دے کر جس طرح فلسطین سے بے دخل کر دیا تھا، بائیبل کے بیان کے مطابق اس کے وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ لوہے کی رتھیں استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس دوسرے آہنی ہتھیار بھی تھے (یشوع باب ۱۷۔ آیت ۱۶۔ قُضاۃ باب ۱۔ آیت ۱۹۔ باب ۴۔ آیت ۲-۳)۔ ۱۰۲۰ ق م میں جب طالوت خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کا فرمانروا ہوا تو اس نے پیہم شکستیں دے کر ان لوگوں سے فلسطین کا بڑا حصہ واپس لے لیا، اور پھر حضرت داؤد (۱۰۰۴ - ۹۶۵ ق م) نے نہ صرف فلسطین و شرق اردن، بلکہ شام کے بھی بڑے حصے پر اسرائیلی سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانہ میں آہن سازی کا وہ راز جو حِتّیوں اور فِلستیوں کے قبضے میں تھا، بے نقاب ہو گیا، اور صرف بے نقاب ہی نہ ہوا بلکہ آہن سازی کے ایسے طریقے بھی نکل آئے جن سے عام استعمال کے لیے لوہے کی سستی چیزیں تیار ہونے لگیں۔ فلسطین کے جنوب میں اَدُوم کا علاقہ خام لوہے (IRONE ORE)

نیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے۔ اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو

کی دولت سے مالا مال ہے، اور حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں، ان میں بکثرت ایسی جگہوں کے آثار ملے ہیں جہاں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ عقبہ (ایلہ) سے متصل حضرت سلیمان کے زمانے کی بندرگاہ عصیون جابر کے آثارِ قدیمہ میں جو بھٹی ملی ہے اس کے معائنے سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں بعض وہ اصول استعمال کیے جاتے تھے جو آج جدید ترین زمانے کی (BLAST FURNACES) میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہ ایک قدرتی بات ہے کہ حضرت داؤد نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس جدید دریافت کو جنگی اغراض کے لیے استعمال کیا ہو گا، کیونکہ تھوڑی ہی مدت پہلے آس پاس کی دشمن قوموں نے اسی لوہے کے ہتھیاروں سے ان کی قوم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔

۷۲ حضرت داؤد کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول ص ۱۹۱۔ جلد دوم ص ۵۹۷-۶۲۴۔

۷۳ اس کی تفصیل سورۂ سبا میں یہ آئی ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ "اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا صبح کو اور ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا شام کو" پھر اس کی مزید تفصیل سورۂ ص میں یہ آتی ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ "پس ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے بسہولت چلتی تھی جدھر وہ جانا چاہتا تھا" اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کو حضرت سلیمان کے لیے اس طرح تابعِ امر کر دیا گیا تھا کہ ان کی مملکت سے ایک مہینے کی راہ تک کے مقامات کا سفر بسہولت کیا جا سکتا تھا۔ جانے میں بھی ہمیشہ ان کی مرضی کے مطابق باد موافق ملتی تھی اور واپسی پر بھی۔ بائیبل اور جدید تاریخی تحقیقات سے اس مضمون پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان نے اپنے دورِ سلطنت میں بہت بڑے پیمانے پر بحری تجارت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک طرف عصیون جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحرِ احمر میں یمن اور دوسرے جنوبی و مشرقی ممالک کی طرف جاتے تھے۔ اور دوسری طرف بحرِ روم کے بندرگاہوں سے ان کا

اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ اُن سب کے نگراں ہم ہی تھے۔

بیڑہ (جسے بائیبل میں "ترسیسی بیڑہ" کہا گیا ہے) مغربی ممالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ عصیون جابر میں ان کے زمانے کی جو عظیم الشان بھٹی ملی ہے اس کے مقابلے کی کوئی بھٹی مغربی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ میں ابھی تک نہیں ملی۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں اَدوم کے علاقہ عَربہ کی کانوں سے خام لوہا اور تانبا لایا جاتا تھا اور اس بھٹی میں پگھلا کر اسے دوسرے کاموں کے علاوہ جہاز سازی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے قرآن مجید کی اُس آیت کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے جو سورۂ سبا میں حضرت سلیمان کے متعلق آئی ہے کہ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ "اور ہم نے اس کے لیے پگھلی ہوئی دھات کا چشمہ بہا دیا"۔ نیز اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت سلیمان کے لیے ایک ایک مہینے کی راہ تک ہوا کی رفتار کو "مسخر" کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اُس زمانے میں بحری سفر کا سارا انحصار بادِ موافق ملنے پر تھا، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت سلیمان پر یہ کرم خاص تھا کہ وہ ہمیشہ اُن کے دونوں بحری بیڑوں کو اُن کی مرضی کے مطابق ملتی تھی۔ تاہم اگر ہوا پر حضرت سلیمان کو حکم چلانے کا بھی کوئی اختیار دیا گیا ہو، جیسا کہ تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ (اس کے حکم سے چلتی تھی) کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی مملکت کا آپ مالک ہے۔ اپنے جس بندے کو جو اختیارات چاہے دے سکتا ہے جب وہ خود کسی کو کوئی اختیار دے تو ہمارا دل دکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

۷۵ سورۂ سبا میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے: وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ، وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ . . . . فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ "اور جنوں میں سے ایسے جن ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اُس کے آگے کام کرتے تھے اور جو ہمارے حکم سے کوئی ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھاتے۔ وہ اُس کے لیے جیسے وہ چاہتا قصر اور مجسمے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے . . . . پھر

اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوب علیہ السلام[۷۶] کو دی تھی۔ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے رب

جب ہم نے سلیمان کو وفات دے دی تو ان جنوں کو اس کی موت پر مطلع کرنے والی کوئی چیز نہ تھی مگر زمین کا کیڑا (یعنی گھن) جو ان کے عصا کو کھا رہا تھا۔ پس جب وہ گر پڑا تو جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب داں ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں اتنی مدت تک مبتلا نہ رہتے"۔ اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو شیاطین حضرت سلیمان کے لیے مسخر ہوئے تھے، اور جو اُن کے لیے مختلف خدمات انجام دیتے تھے، وہ جن تھے، اور جن بھی وہ جن جن کے بارے میں مشرکین عرب کا یہ عقیدہ تھا، اور جو خود اپنے بارے میں بھی یہ غلط فہمی رکھتے تھے کہ ان کو علم غیب حاصل ہے۔ اب ہر شخص جو قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھے، اور اس کو اپنے تعصبات اور پیشگی قائم کیے ہوئے نظریات کا تابع بنائے بغیر پڑھے، یہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں قرآن مطلق "شیطان" اور "جن" کے الفاظ استعمال کرتا ہے وہاں اس کی مراد کونسی مخلوق ہوتی ہے، اور قرآن کی رُو سے وہ کونسے جن ہیں جن کو مشرکین عرب عالم الغیب سمجھتے تھے۔

جدید زمانے کے مفسرین یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ وہ جن اور شیاطین جو حضرت سلیمان کے لیے مسخر کیے گئے تھے، انسان تھے اور آس پاس کی قوموں میں سے فراہم ہوئے تھے۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں اُن کی اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ قصہ آیا ہے وہاں کا سیاق و سباق اور انداز بیان اس تاویل کو راہ دینے سے صاف انکار کرتا ہے۔ حضرت سلیمان کے لیے عمارتیں بنانے والے اگر انسان ہی تھے تو آخر یہ انہی کی کونسی خصوصیت تھی جس کو اس شان سے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ اہرام مصری سے لے کر نیویارک کی فلک شگاف عمارتوں تک کس چیز کو انسانوں نے نہیں بنایا ہے اور کس بادشاہ یا رئیس یا ملک التجار کے لیے وہ "جن" اور "شیاطین" فراہم نہیں ہوئے جو آپ حضرت سلیمان کے لیے فراہم کر رہے ہیں؟

[۷۶] حضرت ایوب کی شخصیت، زمانہ، قومیت، ہر چیز کے بارے میں اختلاف ہے۔ جدید زمانے کے محققین میں سے کوئی ان کو اسرائیلی قرار دیتا ہے، کوئی مصری اور کوئی عرب۔ کسی کے نزدیک ان کا زمانہ حضرت موسیٰ سے پہلے کا ہے، کوئی انہیں حضرت داؤد و سلیمان کے زمانے کا آدمی قرار دیتا ہے، اور کوئی ان سے بھی متأخر

کو پکارا کہ "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے"[۷۶]۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اُسے تھی اُس کو دور کر دیا،[۷۷] اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ ان کے ساتھ اتنے

لیکن سب کے قیاسات کی بنیاد اُس سِفرِ ایوب یا صحیفۂ ایوب پر ہے جو بائبل کے مجموعۂ کتبِ مقدسہ میں شامل ہے۔ اسی کی زبان، اندازِ بیان اور موادِ کلام کو دیکھ کر یہ مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں، نہ کہ کسی اور تاریخی شہادت پر۔ اور اس سفرِ ایوب کا حال یہ ہے کہ اس کے اپنے مضامین میں بھی تضاد ہے اور اس کا بیان قرآن مجید کے بیان سے بھی اتنا مختلف ہے کہ دونوں کو بیک وقت نہیں مانا جا سکتا۔ لہٰذا ہم اُس پر قطعاً اعتماد نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتماد شہادت اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ یسعیاہ نبی اور حزقی ایل نبی کے صحیفوں میں ان کا ذکر آیا ہے، اور یہ صحیفے تاریخی حیثیت سے زیادہ مستند ہیں۔ یسعیاہ نبی آٹھویں صدی اور حزقی ایل نبی چھٹی صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نویں صدی یا اس سے پہلے کے بزرگ ہیں۔ رہی ان کی قومیت تو سورۂ نساء (رکوع ۲۳) اور سورۂ انعام (رکوع ۱۰) میں جس طرح ان کا ذکر آیا ہے اس سے گمان تو یہی ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل ہی میں سے تھے، مگر وَہب بن مُنَبِّہ کا یہ بیان بھی کچھ بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ حضرت اسحاق کے بیٹے عیسُو کی نسل سے تھے۔

۷۶ دعا کا انداز کس قدر لطیف ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد بس یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ "تو ارحم الراحمین ہے"۔ آگے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں، کوئی عرضِ مدعا نہیں، کسی چیز کا مطالبہ نہیں۔ اس طرزِ دعا میں کچھ ایسی شان نظر آتی ہے جیسے کوئی انتہائی صابر و قانع اور شریف و خوددار آدمی پے در پے فاقوں سے بے تاب ہو اور کسی نہایت کریم النفس ہستی کے سامنے بس اتنا کہہ کر رہ جائے کہ "میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں"۔ آگے کچھ اس کی زبان سے نہ نکل سکے۔

۷۷ سورۂ ص کے چوتھے رکوع میں اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ، "اپنا پاؤں مارو، یہ ٹھنڈا پانی موجود ہے نہانے کو اور پینے کو"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر پاؤں مارتے ہی اللہ نے ان کے لیے ایک قدرتی چشمہ جاری کر دیا جس کے پانی میں یہ خاصیت تھی کہ اس سے غسل کرنے اور اس کو پینے سے ان کی بیماری دور ہو گئی۔ یہ علاج اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کو کوئی سخت

ہی اور بھی دیے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے ۷۹

جلدی بیماری ہو گئی تھی، اور بائبل کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ان کا جسم سر سے پاؤں تک پھوڑوں سے بھر گیا تھا (ایوب، باب ۲، آیت ۷)۔

۷۹ اس قصے میں قرآن مجید حضرت ایوب کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں، اور پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ لیکن دوسری طرف بائبل کی سفرِ ایوب پڑھیے تو وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسم شکایت، اور اپنی مصیبت پر ہمہ تن فریاد بنا ہوا ہے۔ بار بار اُس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں "نابود ہو وہ دن جس میں مَیں پیدا ہوا"، "مَیں رحم ہی میں کیوں نہ مر گیا"، "مَیں نے پیٹ سے نکلتے ہی کیوں نہ جان دے دی"۔ اور بار بار وہ خدا کے خلاف شکایتیں کرتا ہے کہ "قادرِ مطلق کے تیر میرے اندر لگے ہوئے ہیں، میری روح انہی کے زہر کو پی رہی ہے، خدا کی ڈراؤنی باتیں میرے خلاف صف باندھے ہوئے ہیں"۔ "اے بنی آدم کے ناظر، اگر مَیں نے گناہ کیا ہے تو تیرا کیا بگاڑتا ہوں؟ تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنا لیا ہے یہاں تک کہ مَیں اپنے آپ پر بوجھ ہوں؟ تو میرا گناہ کیوں نہیں معاف کرتا اور میری بدکاری کیوں نہیں دُور کر دیتا؟" "مَیں خدا سے کہوں گا کہ مجھے ملزم نہ ٹھیرا مجھے بتا کہ تو مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز کو حقیر جانے اور شریروں کی مشورت کو روشن کرے؟" اُس کے تین دوست آکر اسے تسلی دیتے ہیں اور اس کو صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتے ہیں، مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ ان کی تلقین کے جواب میں پے درپے خدا پر الزام رکھے چلا جاتا ہے اور ان کے سمجھانے کے باوجود اصرار کرتا ہے کہ خدا کے اس فعل میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے، صرف ایک ظلم ہے جو مجھ جیسے ایک متقی و عبادت گزار آدمی پر کیا جا رہا ہے۔ وہ خدا کے اس انتظام پر سخت اعتراضات کرتا ہے کہ ایک طرف بدکار نوازے جاتے ہیں اور دوسری طرف نیکوکار ستائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی نیکیاں گناتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں، اور پھر کہتا ہے کہ خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس قصور کی پاداش میں کیا گیا ہے۔ اس کی یہ زبان درازی اپنے خالق کے مقابلے میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آخر کار اُس کے دوست اس کی باتوں کا

جواب دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ چپ ہو جاتے ہیں تو ایک چوتھا آدمی جو ان کی باتیں خاموش سن رہا تھا بیچ میں دخل دیتا ہے اور ایوب کو بے تحاشا اس بات پر ڈانٹتا ہے کہ " اُس نے خدا کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو راست ٹھیرایا " اس کی تقریر ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں اللہ میاں خود بول پڑتے ہیں اور پھر ان کے اور ایوب کے درمیان خوب دوبدو بحث ہوتی ہے۔ اس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اُس صبرِ مجسّم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کے لیے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصہ کچھ، اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے۔ تینوں حصوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابتدائی حصہ کہتا ہے کہ ایوب ایک نہایت راست باز، خدا ترس اور نیک شخص تھا، اور اس کے ساتھ اتنا دولت مند کہ " اہلِ مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا " ایک روز خدا کے ہاں اُس کے (یعنی خود اللہ میاں کے) بیٹے حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ شیطان بھی آیا۔ خدا نے اس محفل میں اپنے بندے ایوب پر فخر کا اظہار کیا۔ شیطان نے کہا آپ نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے اُس کے بعد وہ شکر نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ ذرا اس کی نعمت چھین کر دیکھیے۔ وہ آپ کے منہ پر آپ کی تکفیر نہ کرے تو میرا نام شیطان نہیں۔ خدا نے کہا، اچھا اُس کا سب کچھ تیرے اختیار میں دیا جاتا ہے البتہ اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچائیو۔ شیطان نے جا کر ایوب کے تمام مال و دولت کا اور اس کے پورے خاندان کا صفایا کر دیا اور ایوب ہر چیز سے محروم ہو کر بالکل اکیلا رہ گیا۔ مگر ایوب کی آنکھ پر میل نہ آیا۔ اس نے خدا کو سجدہ کیا اور کہا " ننگا ہی میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو۔" پھر ایک دن ویسی ہی محفل اللہ میاں کے ہاں جمی۔ ان کے بیٹے بھی آئے اور شیطان بھی حاضر ہوا۔ اللہ میاں نے شیطان کو جتایا کہ دیکھ لے، ایوب کیسا راست باز آدمی ثابت ہوا۔ شیطان نے کہا، جناب، ذرا اس کے جسم پر مصیبت ڈال کر دیکھیے۔ وہ آپ کے منہ پر آپ کی " تکفیر" کرے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا، اچھا، جا، اُس کو تیرے اختیار میں دیا گیا، بس اس کی جان محفوظ رہے۔ چنانچہ شیطان واپس ہوا اور آ کر اس نے " ایوب کو تلوے سے چاند تک دردناک پھوڑوں سے دکھ دیا " اس کی

بیوی نے اس سے کہا، "کیا تو اب بھی اپنی راستی پر قائم رہے گا؟ خدا کی تکفیر کر اور مر جا۔" اس نے جواب دیا "تو ناداں عورت کی سی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سے سکھ پائیں اور دکھ نہ پائیں۔"

یہ ہے سفر ایوب کے پہلے اور دوسرے باب کا خلاصہ۔ لیکن اس کے بعد تیسرے باب سے ایک دوسرا ہی مضمون شروع ہوتا ہے جو بیالیسویں باب تک ایوب کی بے صبری اور خدا کے خلاف شکایات و الزامات کی ایک مسلسل داستان ہے، اور اس سے پوری طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایوب کے بارے میں خدا کا اندازہ غلط اور شیطان کا اندازہ صحیح تھا۔ پھر بیالیسویں باب میں خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے خوب دو بدو بحث کر لینے کے بعد، صبر و شکر اور توکل کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ میاں کی ڈانٹ کھا کر، ایوب اُن سے معافی مانگ لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے اس کی تکلیفیں دور کر دیتے ہیں اور جتنا کچھ پہلے اس کے پاس تھا اس سے دوچند اُسے دے دیتے ہیں۔ اس آخری حصے کو پڑھتے وقت آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایوب اور اللہ میاں، دونوں شیطان کے چیلنج کے مقابلے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، اور پھر محض اپنی بات رکھنے کے لیے اللہ میاں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے معافی مانگنے پر مجبور کیا ہے، اور اس کے معافی مانگتے ہی اسے قبول کر لیا ہے تاکہ شیطان کے سامنے ان کی سبکی نہ ہو۔

یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے، نہ خود حضرت ایوب کا۔ بلکہ یہ حضرت ایوب کے زمانے کی بھی نہیں ہے۔ ان کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصۂ ایوب کو بنیاد بنا کر "یوسف زلیخا" کی طرح ایک داستان لکھی ہے اور اس میں ایوب، الیفز تیمانی، سوخی بلدو، نعماتی صوفر، براکیل بوزی کا بیٹا الیہو، چند کیرکٹر ہیں جن کی زبان سے نظام کائنات کے متعلق دراصل وہ خود اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری اور اس کے زور بیان کی جس قدر جی چاہے داد دے لیجیے، مگر کتب مقدسہ کے مجموعے میں ایک صحیفۂ آسمانی کی حیثیت سے اس کو جگہ دینے کے کوئی معنی نہیں۔ ایوب علیہ السلام کی سیرت سے اس کا بس اتنا ہی تعلق ہے جتنا "یوسف زلیخا" کا تعلق سیرت یوسفی سے ہے، بلکہ شاید اتنا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے ابتدائی اور آخری حصے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن میں صحیح تاریخ کا ایک عنصر پایا جاتا ہے، اور وہ شاعر نے یا تو زبانی روایات سے لیا ہو گا جو اس کے زمانے میں مشہور ہوں گی، یا پھر کسی صحیفے سے اخذ کیا ہو گا جو اب ناپید ہے۔

اور یہی نعمت اسماعیل اور ادریس [۸۰] اور ذوالکفل [۸۱] کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو ہم نے

[۸۰] تشریح کے لیے سورۂ مریم رکوع ۴ کے حواشی ملاحظہ ہوں

[۸۱] ذوالکفل کا لفظی ترجمہ ہے "صاحب نصیب"، اور مراد ہے اخلاقی بزرگی اور ثواب آخرت کے لحاظ سے صاحب نصیب، نہ کہ دنیوی فوائد و منافع کے لحاظ سے۔ یہ ان بزرگ کا نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ قرآن مجید میں دو جگہ ان کا ذکر آیا ہے اور دونوں جگہ ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ نام نہیں لیا گیا۔

مفسرین کے اقوال اس معاملہ میں بہت مضطرب ہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں، کس ملک اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اور کس زمانے میں گزرے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حضرت زکریا کا دوسرا نام ہے (حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر ابھی آگے آ رہا ہے)، کوئی کہتا ہے یہ حضرت الیاس ہیں، کوئی یوشع بن نون کا نام لیتا ہے، کوئی کہتا ہے یہ الیسع ہیں (حالانکہ یہ بھی غلط ہے، سورۂ ص میں ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے اور ذوالکفل کا الگ)، کوئی انہیں حضرت الیسع کا خلیفہ بتاتا ہے، اور کسی کا قول ہے کہ یہ حضرت ایوب کے بیٹے تھے جو ان کے بعد نبی ہوئے اور ان کا اصلی نام بشر تھا۔ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حزقیال (حزقی ایل) نبی ہیں جو بنی اسرائیل کی اسیری کے زمانے میں نبوت پر سرفراز ہوئے اور نہر خابور کے کنارے ایک بستی میں فرائض نبوت انجام دیتے رہے۔"

ان مختلف اقوال کی موجودگی میں یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع یہ کونسے نبی ہیں۔ موجودہ زمانے کے مفسرین نے اپنا میلان حزقی ایل نبی کی طرف ظاہر کیا ہے، لیکن ہمیں کوئی معقول دلیل ایسی نہیں ملی جس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جا سکے۔ تاہم اگر اس کے لیے کوئی دلیل مل سکے تو یہ رائے قابل ترجیح ہو سکتی ہے، کیونکہ بائبل کے صحیفہ حزقی ایل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ اس تعریف کے مستحق ہیں جو اس آیت میں کی گئی ہے، یعنی صابر اور صالح۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو یروشلم کی آخری تباہی سے پہلے بخت نصر کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ بخت نصر نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نوآبادی دریائے خابور کے کنارے قائم کر دی تھی جس کا نام تل ابیب تھا۔ اسی مقام پر ۵۹۴ ق م میں حضرت حزقی ایل نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے، جبکہ ان کی عمر ۳۰ سال تھی، اور مسلسل ۲۲ سال ایک طرف گرفتار بلا اسرائیلیوں کو اور دوسری طرف

اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے۔
اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا[۸۲]۔ یاد کرو جبکہ وہ بگڑ کر چلا گیا[۸۳] اور سمجھا کہ ہم اس پر قابو نہ پاسکیں گے[۸۴]۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں سے پکارا[۸۵]: "نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات بے شک میں نے قصور کیا"۔ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی، اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔
اور زکریا کو، جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "اے پروردگار، مجھے اکیلا نہ چھوڑ، اور بہترین

یروشلم کے غافل و سرشار باشندوں اور حکمرانوں کو چونکانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کار عظیم میں ان کے انہماک کا جو حال تھا اُس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نبوت کے نویں سال ان کی بیوی، جنہیں وہ خود "منظورِ نظر" کہتے ہیں، انتقال کر جاتی ہیں، لوگ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور یہ اپنا دکھڑا چھوڑ کر اپنی ملت کو خدا کے اُس عذاب سے ڈرانا شروع کر دیتے ہیں جو اُس کے سر پر تُلا کھڑا تھا (باب ۲۴۔ آیات ۱۵-۲۷)۔ بائیبل کا صحیفۂ حزقی ایل اُن صحیفوں میں سے ہے جنہیں پڑھ کر واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الہامی کلام ہے۔

۸۲ مراد ہیں حضرت یونس۔ کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں "ذوالنون" اور "صاحب الحوت" یعنی "مچھلی والے" کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مچھلی والا اُنہیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ مچھلیاں پکڑتے یا بیچتے تھے بلکہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا جیسا کہ سورۂ صافات (رکوع ۵) میں بیان ہوا ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۳۱۲-۳۱۳۔

۸۳ یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے قبل اس کے کہ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم آتا اور ان کے لیے اپنی ڈیوٹی چھوڑنا جائز ہوتا۔

۸۴ انہوں نے خیال کیا کہ اس قوم پر تو عذاب آنے والا ہے۔ اب مجھے کہیں چل کر پناہ لینی چاہیے تاکہ خود بھی عذاب میں نہ گھر جاؤں۔ گویا وہ اس گمان میں تھے کہ وہ خود اپنی تدبیر سے اپنے آپ کو عذاب سے بچا سکتے ہیں۔

وارث تو تو ہی ہے"۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا[۸۶]۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دَوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے[۸۷]۔

اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی[۸۸]۔ ہم نے اُس کے اندر اپنی رُوح سے

---

۸۵ یعنی مچھلی کے پیٹ میں جو خود تاریک تھا، اور اوپر سے سمندر کی تاریکیاں مزید۔

۸۶ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۲۴۷ تا ۲۵۰ - اور سورۂ مریم رکوع اول کے حواشی - بیوی کو درست کر دینے سے مراد ان کا بانجھ پن دور کر دینا اور سن رسیدگی کے باوجود حمل کے قابل بنا دینا ہے "وہ بہترین وارث تو تو ہی ہے"، یعنی تو اولاد نہ بھی دے تو غم نہیں، تیری ذاتِ پاک وارث ہونے کے لیے کافی ہے۔

۸۷ اِس سیاق و سباق میں انبیاء کا ذکر جس مقصد کے لیے کیا گیا ہے اسے پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ حضرت زکریا کے واقعے کا ذکر کرنے سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی محض بندے اور انسان تھے۔ الوہیت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ دوسروں کو اولاد بخشنے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ کے آگے اولاد کے لیے ہاتھ پھیلانے والے تھے۔ حضرت یونس کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ایک نبی اولوالعزم ہونے کے باوجود جب ان سے قصور سرزد ہوا تو سزا دے ڈالی گئی، اور جب وہ اپنے رب کے آگے جھک گئے تو ان پر فضل بھی ایسا کیا گیا کہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لائے گئے۔ حضرت ایوب کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نبی کا مبتلائے مصیبت ہونا کوئی نرالی بات نہیں ہے، اور نبی بھی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو خدا ہی کے آگے شفا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کو شفا دینے والا نہیں، خدا سے شفا مانگنے والا ہوتا ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ ایک طرف یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ یہ سارے انبیاء توحید کے قائل تھے اور اپنی حاجات ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ بھی جتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ غیر معمولی طور پر اپنے نبیوں کی مدد کرتا رہا ہے، آغاز میں خواہ کیسی ہی آزمائشوں سے ان کو سابقہ پیش آیا ہو مگر آخر کار ان کی دعائیں معجزانہ شان کے ساتھ پوری ہوئی ہیں۔

۸۸ مراد ہیں حضرت مریم علیہا السلام۔

پھونکا اور اُسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔[۹۰]

یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم میری عبادت کرو۔ مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انہوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔[۹۱]

۸۹؎ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (ص۔ رکوع ۵) "میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں، پس (اے فرشتو) جب میں اسے پورا بنا لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا" اور یہی بات حضرت عیسٰی کے متعلق مختلف مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا۔ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (رکوع ۲۳) "اللہ کا رسول اور اس کا فرمان جو مریم کی طرف القا کیا گیا اور اس کی طرف سے ایک روح" اور سورۂ تحریم میں ارشاد ہوا وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (رکوع ۲) "اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی پس پھونک دیا ہم نے اُس میں اپنی روح سے" اس کے ساتھ یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسٰی کی پیدائش اور حضرت آدم کی پیدائش کو ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیتا ہے، چنانچہ سورۂ آل عمران میں فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (رکوع ۶) "عیسٰی کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جس کو اللہ نے مٹی سے بنایا پھر فرمایا "ہو جا" اور وہ موجود تھا" ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معمولی طریقۂ تخلیق کے بجائے جب اللہ تعالیٰ کسی کو براہ راست اپنے حکم سے وجود میں لا کر زندگی بخشتا ہے تو اس کو "اپنی روح سے پھونکنے" کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ اس روح کی نسبت اللہ کی طرف کس معنی میں ہے، اور اس کے پھونکنے کا ٹھیک مطلب کیا ہے، اس کو ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۲۷ - ۴۲۸۔

۹۰؎ یعنی یہ دونوں ماں بیٹے خدا یا خدائی میں شریک نہ تھے بلکہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشان تھے۔ "نشانی" وہ کس معنی میں تھے، اس کی تشریح سورۂ مریم رکوع ۲ کے حواشی میں گزر چکی ہے۔

۹۱؎ "تم" کا خطاب تمام انسانوں کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے انسانو، تم سب حقیقت میں ایک ہی

سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے ع پھر جو نیک عمل کرے گا، اس حال میں کہ وہ مومن ہو، تو اس کے کام
کی ناقدری نہ ہوگی، اور اُسے ہم لکھ رہے ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ
پھر پلٹ سکے ۹۲۔ یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور ہر بلندی سے وہ نکل
پڑیں گے اور وعدۂ برحق کے پورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا ۹۳ تو یکایک اُن لوگوں کے دیدے

امت اور ایک ہی ملت تھے، دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے، اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی بندگی و پرستش کی جانی چاہیے۔ بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے وہ اسی دین کو بگاڑ کر بنا لیے گئے۔ اس کی کوئی چیز کسی نے لی، اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے، اور پھر ہر ایک نے ایک جز اُس کا لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا ڈالیں۔ اس طرح یہ بے شمار ملتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی نے فلاں مذہب کی بنا ڈالی، اور انسانیت میں یہ ملتوں اور مذہبوں کا تفرقہ انبیاء کا ڈالا ہوا ہے، محض ایک غلط خیال ہے۔ محض یہ بات کہ مختلف ملتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاء کی طرف منسوب کر رہی ہیں، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملتوں اور مذہبوں کا یہ اختلاف انبیاء کا ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء دس مختلف مذہب نہیں بنا سکتے تھے اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی سکھا سکتے تھے۔

۹۲ اس آیت کے تین مطلب ہیں:

ایک یہ کہ جس قوم پر ایک مرتبہ عذابِ الٰہی نازل ہو چکا ہو وہ پھر کبھی نہیں اُٹھ سکتی۔ اس کی نشاۃِ ثانیہ اور اس کی حیاتِ نو ممکن نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ ہلاک ہو جانے کے بعد پھر اس دنیا میں اُس کا پلٹنا اور اسے دوبارہ امتحان کا موقع ملنا غیر ممکن ہے۔ پھر تو اللہ کی عدالت ہی میں اس کی پیشی ہوگی۔

تیسرے یہ کہ جس قوم کی بدکاریاں اور زیادتیاں اور ہدایتِ حق سے پیہم روگردانیاں اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ہلاکت کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اُسے پھر رجوع اور توبہ و انابت کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اُس کے لیے پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ ضلالت سے ہدایت کی طرف پلٹ سکے۔

پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا تھا۔ کہیں گے "ہائے ہماری کم بختی، ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے، بلکہ ہم خطا کار تھے"[۹۴] (اُن سے کہا جائے گا) "تم، اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم پوجتے تھے، جہنم کا لقمہ ہو، وہیں تم کو جانا ہے"[۹۵]۔ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں

۹۳ یاجوج وماجوج کی تشریح سورۂ کہف رکوع ۱۱ کے حواشی میں کی جا چکی ہے۔ اُن کے کھول دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی شکاری درندہ یکایک پنجرے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ "وعدۂ حق پورا ہونے کا وقت قریب آلگے گا" کا اشارہ صاف طور پر اس طرف ہے کہ یاجوج وماجوج کی یہ عالمگیر یورش آخری زمانہ میں ہوگی اور اس کے بعد جلدی ہی قیامت آجائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد اس معنی کو اور زیادہ کھول دیتا ہے جو مسلم نے حُذیفہ بن اَسید الغفاری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ "قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ دُھواں، دجّال، دآبۃ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ ابن مریم کا نزول، یاجوج وماجوج کی یورش، اور تین بڑے خسوف (زمین کا دھنسایا (LANDSLIDES)، ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی بس اس کے بعد قیامت آجائے گی)۔ ایک اور حدیث میں یاجوج وماجوج کی یورش کا ذکر کر کے حضورؐ نے فرمایا اُس وقت قیامت اس قدر قریب ہوگی جیسے پورے پیٹوں کی حاملہ کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ بچہ جن دے، رات کو یا دن کو (کالحامل المتم لا یدری اھلھا متی تفجؤھم بولدھا لیلاً او نہاراً)۔

۹۴ "غفلت" میں پھر ایک طرح کی معذرت پائی جاتی ہے، اس لیے وہ اپنی غفلت کا ذکر کرنے کے بعد پھر خود ہی صاف صاف اعتراف کریں گے کہ ہم کو انبیاء نے آکر اس دن سے خبردار کیا تھا، لہٰذا درحقیقت ہم غافل و بے خبر نہ تھے بلکہ خطا کار تھے۔

۹۵ روایات میں آیا ہے کہ اس آیت پر عبداللہ بن الزِّبَعری نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو صرف ہمارے ہی معبود نہیں، مسیح اور عُزیر اور ملائکہ بھی جہنم میں جائیں گے، کیونکہ دنیا میں ان کی بھی عبادت کی جاتی ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نعم، کل من احب ان یُعبد من دون اللہ فھو مع من عبدہٗ،

نہ جاتے۔ اب سب کو ہمیشہ اسی میں رہنا ہے"۔ وہاں وہ پھنکارے ماریں گے[۹۶] اور حال یہ ہو گا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیگی۔ رہے وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو گا، تو وہ یقیناً اس سے دُور رکھے جائیں گے،[۹۷] اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے، اور

---

[۹۵] ہاں، ہر وہ شخص جس نے پسند کیا کہ اللہ کے بجائے اُس کی بندگی کی جائے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جنہوں نے اس کی بندگی کی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے خلقِ خدا کو خدا پرستی کی تعلیم دی تھی اور لوگ انہی کو معبود بنا بیٹھے، یا جو غریب اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ دنیا میں ان کی بندگی کی جا رہی ہے اور اس فعل میں ان کی خواہش اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے، ان کے جہنم میں جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس شرک کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ البتہ جنہوں نے خود معبود بننے کی کوشش کی اور جن کا خلقِ خدا کے اس شرک میں واقعی دخل ہے وہ سب اپنے عابدوں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جہنم میں جائیں گے جنہوں نے اپنی اغراض کے لیے غیر اللہ کو معبود بنوایا تھا۔ شیطان بھی اسی ذیل میں آتا ہے، کیونکہ اُس کی تحریک پر جن ہستیوں کو معبود بنایا جاتا ہے، اصل معبود وہ نہیں بلکہ خود شیطان ہوتا ہے جس کے امر کی اطاعت میں یہ فعل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پتھر اور لکڑی کے بتوں اور دوسرے سامانِ پرستش کو بھی مشرکین کے ساتھ جہنم میں داخل کیا جائے گا تاکہ وہ ان پر آتشِ جہنم کے اور زیادہ بھڑکنے کا سبب بنیں اور یہ دیکھ کر انہیں مزید تکلیف ہو کہ جن سے وہ شفاعت کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے وہ اُن پر اُلٹے عذاب کی شدت کے موجب بنے ہوئے ہیں۔

[۹۶] اصل میں لفظ زَفِیر استعمال ہوا ہے۔ سخت گرمی، محنت اور تکان کی حالت میں جب آدمی لمبا سانس لے کر اس کو ایک پھنکار کی شکل میں نکالتا ہے تو اسے عربی میں زَفِیر کہتے ہیں۔

[۹۷] اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں نیکی اور سعادت کی راہ اختیار کی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ وعدہ فرما چکا ہے کہ وہ اس کے عذاب سے محفوظ رہیں گے اور ان کو نجات دی جائے گی۔

وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من بھاتی چیزوں کے درمیان رہیں گے۔ انتہائی گھبراہٹ کا وقت اُن کو ذرا پریشان نہ کرے گا،۹۸ اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ "یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔"

وہ دن جبکہ آسمان کو ہم یُوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طُومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی اُسی طرح ہم پھر اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے، اور یہ کام ہمیں بہرحال کرنا ہے۔ اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے، اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے۔۹۹

۹۸ یعنی روزِ حشر اور خدا کے حضور پیشی کا وقت، جو عام لوگوں کے لیے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی کا وقت ہوگا۔ اُس وقت نیک لوگوں پر ایک اطمینان کی کیفیت طاری رہے گی۔ اس لیے کہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہوگا۔ ایمان و عمل صالح کی جو پونجی لیے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہوئے تھے وہ اُس وقت خدا کے فضل سے اُن کی ڈھارس بندھائے گی اور خوف و حُزن کے بجائے اُن کے دلوں میں یہ امید پیدا کرے گی کہ عنقریب وہ اپنی سعی کے نتائجِ خیر سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

۹۹ اس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس سے ایک ایسا مطلب نکال لیا ہے جو پورے قرآن کی تردید اور پورے نظامِ دین کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت و فرمانروائی اور زمین کے وسائل پر تصرف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انہی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قاعدۂ کلیہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثتِ زمین ہے۔ جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر اُن قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دنیا میں پہلے وارثِ زمین رہی ہیں اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کافر، مشرک، دہریے، فاسق، فاجر سب یہ وراثت پہلے بھی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پا رہے ہیں۔ جن قوموں میں وہ

تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں جنہیں قرآن صاف الفاظ میں کفر، فسق، فجور، معصیت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں بلکہ نوازی گئیں اور آج بھی نوازی جارہی ہیں۔ فرعون و نمرود سے لے کر اسٹالن تک کتنے ہی ہیں جو کھلم کھلا خدا کے منکر، مخالف، بلکہ مدِ مقابل بنے ہیں اور پھر بھی وارثِ زمین ہوئے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدہ کلیہ تو غلط نہیں ہو سکتا، اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ "صالح" کے اُس مفہوم میں ہے جو اب تک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں جس کے مطابق زمین کے وارث ہونے والے سب لوگ یکساں "صالح" قرار پاسکیں، قطع نظر اس سے کہ وہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق ہوں یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصورِ صلاح کو ڈارونی تصورِ "صلاحیت" (FITNESS) سے لے جاکر ملا دیتے ہیں۔

اس نئی تفسیر کی رُو سے آیتِ زیرِ بحث کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی ممالک کو فتح کرنے اور اُن پر زور و قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی "خدا کا صالح بندہ" ہے اور اُس کا یہ فعل تمام "عابد" انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ "عبادت" اس چیز کا نام ہے جو یہ شخص اور گروہ کر رہا ہے، اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجہ میں وراثتِ زمین سے محروم رہ جاتے ہو تو نہ تمہارا شمار صالحین میں ہو سکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جاسکتا ہے۔

یہ معنی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر "صلاح" اور "عبادت" کا تصور یہ ہے تو پھر وہ ایمان (ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالرُّسُل اور ایمان بالکتب) کیا ہے جس کے بغیر خود اسی قرآن کی رو سے، خدا کے ہاں کوئی عملِ صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اس دعوت کے کیا معنی ہیں کہ اُس نظامِ اخلاق اور قانونِ زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے وہ کافر، فاسق، عذاب کا مستحق اور مغضوبِ بارگاہِ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمانداری

کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ ان سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری عبارت کے ساتھ ایمان، اسلام، توحید، آخرت، رسالت، ہر چیز کے معنی بدل ڈالے تاکہ وہ سب اُن کی اس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں، اور اس ایک چیز کو ٹھیک بٹھانے کی خاطر انہوں نے قرآن کی ساری تعلیمات کو الٹ پلٹ کر ڈالا۔ اس پر لطیفہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی اس مرمتِ دین سے اختلاف کرتے ہیں اُن کو یہ اُلٹا الزام دیتے ہیں کہ "خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں"۔ یہ دراصل مادّی ترقی کی خواہش کا ہیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس بُری طرح لاحق ہو گیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تامّل نہیں کرتے۔

اُن کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے، حالانکہ اصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظامِ فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ کوئی شخص جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ بھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقویٰ اور بھلائی کہتا ہے وہ "مادّی ترقی اور حکمرانی کی صلاحیت" کی ہم معنی نہیں ہے، اور "صالح" کو اگر "صاحبِ صلاحیت" کے معنی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب، جو اس غلطی کا موجب ہوا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے بے تکلف جو معنی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں، حالانکہ ہر آیت کے صحیح معنی صرف وہی ہو سکتے ہیں جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو بہ آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا تھا کہ اوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آ رہا ہے وہ عالمِ آخرت میں مومنینِ صالحین اور کفار و مشرکین کے انجام سے بحث کرتا ہے۔ اس مضمون میں یکایک اس مضمون کے بیان کرنے کا آخر کونسا موقع تھا کہ دنیا میں وراثتِ زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے۔

تفسیر کے صحیح اصولوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب صاف یہ ہے کہ دوسری تخلیق میں، جس کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے، زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہوں گے اور اس ابدی زندگی

کے نظام میں موجودہ عارضی نظامِ زندگی کی سی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورۂ زُمر کے خاتمہ پر بیان کیا گیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفخِ صورِ اوّل و ثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرماتا ہے، پھر کفار کا انجام بیان کر کے نیک لوگوں کا انجام یہ بتاتا ہے کہ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ "اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقویٰ اختیار کیا تھا وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچائے جائیں گے تو ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے منتظم ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم کو، تم بہت اچھے رہے، آؤ اب اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اُس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے" دیکھیے، یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں، اور دونوں جگہ وراثتِ زمین کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا سے۔

اب زبور کو لیجیے جس کا حوالہ آیتِ زیرِ بحث میں دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بائیبل کے مجموعۂ کتبِ مقدسہ میں زبور کے نام سے جو کتاب اس وقت پائی جاتی ہے یہ اپنی اصلی غیر محرّف صورت میں ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں مزامیرِ داؤدؑ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے مزامیر بھی خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اور اصلی زبور کا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم جو زبور اس وقت موجود ہے اُس میں بھی نیکی اور راست بازی اور توکل کی نصیحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہونگے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا، تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا، لیکن حلیم ملک کے وارث ہونگے اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے۔ . . .

اے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں رحمت ہے[تنلہ]۔ ان سے

. . . . اُن کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی . . . . صادق زمین کے وارث ہونگے اور اُس میں ہمیشہ بسے رہیں گے (زبور ۳۷ داؤد کا مزمور۔ آیات ۹-۱۰-۱۱-۱۸-۲۹)

دیکھیے یہاں راست باز لوگوں کے لیے زمین کی دائمی وراثت کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ آسمانی کتابوں کی رُو سے خلود اور ابدی زندگی کا تعلق آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا کی زندگی سے۔

دنیا میں زمین کی عارضی وراثت جس قاعدے پر تقسیم ہوتی ہے اسے سورۂ اعراف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ، "زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے"۔ مشیتِ الٰہی کے تحت یہ وراثت مومن اور کافر، صالح اور فاسق، فرماں بردار اور نافرمان، سب کو ملتی ہے، مگر جزائے اعمال کے طور پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر، جیسا کہ خود فرمایا وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ "اور وہ تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو"۔ اس وراثت میں دوام اور ہمیشگی نہیں ہے۔ یہ مستقل اور دائمی بندوبست نہیں ہے۔ یہ محض ایک امتحان کا موقع ہے جو خدا کے ایک ضابطے کے مطابق دنیا میں مختلف قوموں کو باری باری دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آخرت میں اسی زمین کا دوامی بندوبست ہوگا، اور قرآن کے متعدد واضح ارشادات کی روشنی میں وہ اس قاعدے پر ہوگا کہ "زمین اللہ کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے صرف مومنین صالحین کو اس کا وارث بنائے گا، امتحان کے طور پر نہیں، بلکہ اُس نیک رویّے کی ابدی جزا کے طور پر جو انہوں نے دنیا میں اختیار کیا"۔

تنلہ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے"۔ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دراصل نوعِ انسانی کے لیے خدا کی رحمت اور مہربانی ہے، کیونکہ آپ نے آکر غفلت میں پڑی ہوئی دنیا کو چونکایا ہے، اور اُسے وہ علم دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے، اور اس کو بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے بتا دیا ہے کہ اس کے لیے تباہی کی راہ کونسی ہے اور سلامتی کی راہ کونسی۔ کفارِ مکہ حضورؐ کی بعثت کو اپنے لیے زحمت اور مصیبت

کہو "میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا خدا صرف ایک خدا ہے، پھر کیا تم سرِ اطاعت جھکاتے ہو؟ اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ "میں نے علی الاعلان تم کو خبردار کر دیا ہے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے[111] قریب ہے یا دور۔ اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو باآوازِ بلند کہی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو۔[112] میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ (دیر) تمہارے لیے ایک فتنہ ہے[113] اور تمہیں ایک وقتِ خاص تک کے لیے مزے کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔"

(آخرکار) رسول نے کہا کہ "اے میرے رب، حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، اور لوگو، تم جو باتیں بناتے ہو اُن کے مقابلے میں ہمارا ربِ رحمان ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے۔" ع

سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے، ناخن سے گوشت جدا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو، تم جسے زحمت سمجھ رہے ہو یہ حقیقت میں تمہارے لیے خدا کی رحمت ہے۔

۱۱۱ یعنی خدا کی پکڑ جو دعوتِ رسالت کو رد کر دینے کی صورت میں آئے گی، خواہ کسی نوعیت کے عذاب کی شکل میں آئے۔

۱۱۲ اشارہ ہے اُن مخالفانہ باتوں اور سازشوں اور سرگوشیوں کی طرف جن کا آغاز سورہ میں ذکر کیا گیا تھا۔ وہاں بھی رسول کی زبان سے اِن کا یہی جواب دلوایا گیا تھا کہ جو باتیں تم بنا رہے ہو وہ سب خدا سُن رہا ہے اور جانتا ہے۔ یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ ہوا میں اُڑ گئیں اور کبھی ان کی بازپرس نہ ہوگی۔

۱۱۳ یعنی تم اس تاخیر کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو۔ تاخیر تو اس لیے کی جا رہی ہے کہ تمہیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دی جائے اور جلد بازی کر کے فوراً ہی نہ پکڑ لیا جائے۔ مگر تم اس سے اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہو کہ نبی کی سب باتیں جھوٹی ہیں ورنہ اگر یہ سچا نبی ہوتا اور خدا ہی کی طرف سے آیا ہوتا تو اس کو جھٹلا دینے کے بعد ہم کبھی کے دھر لیے گئے ہوتے۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

(عبدالحمید صدیقی)

بربادی اور کشت و خون کے وہ طوفان اور تخریب و ہلاکت کے وہ شور و شر جنہوں نے ساری دنیا کو تہ و بالا کر رکھا ہے دراصل ایک عالمگیر انقلاب کا پتہ دے رہے ہیں۔ یہ اس بات کی بین دلیل ہیں کہ انسانیت کا قافلہ "کرب و بلا" میں گرفتار ہے اور اپنے لیے فلاح کی کوئی راہ ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کا اضطراب اس حقیقت کی نشان دہی کر رہا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہیں، وہ اپنے نظریات، اپنے افکار، اپنے طرزِ زندگی اور اپنے ماحول میں ایک تبدیلی اور خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کا متمنی ہے، مگر اُسے اپنے مقصد میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ عین اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی محنتوں کا زیاں دیکھتا ہے، مگر سوائے خون کے آنسو بہانے کے اور کچھ کر نہیں پاتا، اُس کی نظر کے سامنے اُس کا اخلاق، اُس کی معیشت، اُس کی معاشرت، اُس کی سیاست تباہ و برباد ہو رہے ہیں مگر اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ ساری ہلاکت و بربادی کس لیے ہے اور اس سے کیونکر نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ وہ ہر آن تخیلات و افکار کے نئے نئے محلات تعمیر کرتا ہے اور اس توقع پر تعمیر کرتا ہے کہ ان کے سائے میں اُسے ابدی آرام و سکون حاصل ہوگا مگر چند لمحے بھی گزرنے نہیں پاتے کہ وہ خود بخود پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔

توڑ پھوڑ کا یہ عمل یُوں تو بڑے عرصہ سے جاری ہے مگر اس کی شدت میں پچھلے چند سالوں سے نہایت حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ شکست و ریخت کے اس سارے کھیل کے متعلق ایک بات جو نہایت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اور سربراہی اب تک

جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اُس کی عمر پوری ہو چکی ہے۔ اُس کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پر آلگا ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ اُن کو اور ان کی اس جاہلی تہذیب کو دنیا میں ایک غالب قوت کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔ اس امر کی شہادت خود اس تہذیب کے حامی پیش کر رہے ہیں۔ یہاں ہم ان بڑے بڑے مفکرین کے چند اقوال نقل کرتے ہیں۔ تاکہ آپ کو اس بات کا ایک معمولی اندازہ ہو سکے۔

پروفیسر آرنلڈ جے۔ ٹائن۔ بی۔ تاریخ انسانی کا ایک عظیم المرتبت عالم ہے۔ اس نے مطالعۂ تاریخ A STUDY OF HISTORY ایسی جامع تصنیف لکھ کر پوری دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ مارچ ۱۹۴۹ء کے ورلڈ ریویو (WORLD REVIEW) میں اس کا ایک مضمون "تاریخ موجودہ انسان کو متنبہ کرتی ہے" (HISTORY WARNS MODERN MAN) شائع ہوا۔ اس میں اُس نے بڑی صفائی اور تفصیل کے ساتھ اس تہذیب کی ناکامی کا ذکر کیا ہے اور پوری جرأت اور ایمانداری کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ موجودہ تہذیب انسان کو صحیح فلاح سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔

"جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤں بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ اس کا بنک اکاؤنٹ، اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے ہیں نتیجہ بڑا خطرناک ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اُسے بازی مار لینی چاہیے۔ لیکن اسے اپنے پتوں اور اپنے ہُنر پر بھروسہ نہیں ہے کہ ان کے بل پر اس کی کامیابی یقینی ہو۔"

"اگر وہ علم النجوم پر اعتقاد رکھتا تو وہ نجومیوں سے التجا کرتا کہ وہ اسے اس کرب سے نجات دلائیں اور ان سے دریافت کرتا کہ کیا وہ اس معرکۂ "مدوجزر" میں کامیاب ہوگا؟ اسے یقین ہے کہ اس کا فیصلہ قسمت پہلے سے کر چکی ہے۔ مگر عہدِ حاضر کا انسان اتنا توہم پرست نہیں کہ رمال پر اعتماد کرے۔ اس لیے وہ مفکرین کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ علمائے اجتماعیات اور معلمین نفسیات سے پوچھتا ہے "تم ہمیں ایک صالح معاشرہ کب تک پہنچا سکو گے؟ کیا ہمیں تباہی سے

بچانے کا انتظام بروقت ہو جائے گا۔ پھر جب وہ اُسے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتے تو وہ مجھ ایسے تاریخ دانوں سے سوال کرتا ہے "جس اُلجھن میں انسانیت آج گرفتار ہے، اس کے پیشِ نظر تاریخ کا انجام کیا ہوگا"؟

"فنی کمالات بجائے خود حکمت یا بقا کے ضامن نہیں ہوسکتے۔ تمدن جب کبھی خود اپنی صنعتی اور مشینی مہارت کے دلدادہ ہوئے تو اس وقت اُن کا قدم ناگزیر طور پر خودکشی کی طرف اُٹھا۔ بعید نہیں کہ تمدن اس قسم کے رجحان کا رُخ بدل لیں اور از سرِ نو پنپ سکیں۔ مگر یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ "آلات"، پر بحیثیت مقصدِ زندگی توجہ کرنا ترک کر دیں۔ یہ چیز جتنی اس زمانے میں درست ہے، اتنی ہی ماضی میں بھی صحیح تھی"۔

"پوری تاریخ سے مجھے ایک ہی سبق ملتا ہے" یہاں کوئی چیز دنیاوی کامیابی سے بڑھ کر ناکام نہیں"۔ اکیس تمدنوں کے مطالعہ کے بعد میرا اس بات پر پختہ یقین ہوگیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت برسرِ عمل رہتی ہے اور وہ اپنے جغرافیائی ماحول، نقل مکانی یا داخلی تغیرات کے پیدا کردہ ہر چیلنج کا جدید اور تخلیقی طریقوں سے بخوبی جواب دے سکیں۔

"آج مشین پر قدرت نے ہمیں سخت خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اپنی صنعتی ترقی سے ہم اس قدر مسحور ہیں کہ ہم ان وسیع تر تخلیقی اقدامات کو بھی، جو ہمارے بقا کے لیے اشد ضروری ہیں، بھول گئے ہیں۔ پرستش انسان کا ایک نہایت ہی طاقت ور فطری داعیہ ہے۔ ہمارے عہد کے پرفتن ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمیں اپنی قوم، اپنے جھنڈے، اور اپنی تاریخ ماضی کو پوجنے کی تربیت دی گئی ہے۔ آدمی کا صرف ایک خدا کی پرستش کرنا ہی اس کے لیے صحیح ہے۔ یہ پہلا حکم ربانی درحقیقت افراد اور معاشروں کی نشوونما کے لیے بھی اوّلین قانون ہے۔ جب ہم اسے توڑ کر اپنے ماضی کے بت کی پرستش شروع کر دیتے ہیں تو ہم ناکام و نامراد ہو جاتے ہیں"۔

"ہماری جدید سائنٹفک ترقیات صنعتی دور کے چیلنج کا ایک تخلیقی جواب تھیں۔ اور ایک نہایت ہی عمدہ جواب! لیکن جو مسائل ہمیں درپیش ہیں، وہ اس نوعیت کے نہیں ہیں کہ ان کا

جائے تجربہ گاہوں سے دیا جائے۔ یہ اخلاقی مسائل ہیں اور سائنس اخلاق کے دائرے میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔

"اپنے مسائل کو خالص مادی تدابیر سے حل کرنے کی ہماری حالیہ مساعی بداہۃً ناکام ہوچکی ہیں اور ہمارے تمام بلند بانگ منصوبے محض مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج بالکل کھل کر ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ . . . ہم نے مشین کو یکسر آزاد کرکے دیکھ لیا ہے اور یہ بات اب واضح ہے کہ انسان کے لیے اخلاقی اقدامات جتنے آج ضروری ہیں گذشتہ زمانوں میں بھی تھے۔ بلکہ اس سے زیادہ فیصلہ کن حد تک ضروری ہیں۔

" جن ۲۱ تمدنوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے، ان کو ملیٹ کر دیکھتے ہوئے انسان کی ذہانت سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ محض دنیا کو اپنا منتہائے مقصود قرار دینے کے بعد پھر کوئی خوشگوار اخلاقی فیصلہ کرسکے گی۔ ہاں! نوعِ انسانی کی محبت ایک تاریخی طاقت ہے لیکن وہ بھی صرف اسی حالت میں جبکہ وہ فطری نتیجہ ہو خداوند تعالیٰ سے گہری وابستگی کا! پس دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ایک فوق الطبعی ایمان کا احیاء ہے۔ اس کے بغیر اس انسان پر، جس کے ہاتھ میں اپنے عمل سے تیار کیے ہوئے خطرناک کھلونے ہیں، کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔"

یہ اقتباس ذرا طویل ہوگیا ہے مگر اس کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ قدرے تفصیل کے ساتھ یورپ کے فکری رجحانات کا مطالعہ کرسکیں۔ یہ رائے کسی "متعصب ملّا" کی نہیں بلکہ اس محقق کی ہے جس کی فکری برتری کے اپنے اور پرائے سب معترف ہیں۔

اسی سلسلہ میں دوسرا شخص جس کو بطورِ شہادت کے ہم پیش کرتے ہیں وہ پی اے سارو کن (P.A. SOROKIM) ہے۔ اس نے اکتوبر ۱۹۴۱ء میں ایک کتاب "ہمارے عہد کا بحران" (THE CRISIS OF OUR AGE) تصنیف کی۔ یہ صاحب ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات کے صدر ہیں اس سے پہلے وہ عمرانیات کے بین الاقوامی ادارہ کے صدر رہ چکے ہیں۔

صاحب موصوف نے اپنی تصنیف میں نہایت ہی ٹھوس اور واضح دلائل کے ساتھ یہ ثابت

کیا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن پر اب نزع کا عالم طاری ہے، اور یہ مصیبت جس میں کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت گرفتار پاتا ہے۔ آفتِ ناگہانی نہیں بلکہ یہ ایک فطری نتیجہ ہے اُس فکر کا جسے یورپ نے پچھلے دو سو سال میں جنم دیا ہے۔ اس عالمگیر فساد کا ذکر جن الفاظ میں اُس نے کیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ اُن پر نہایت ہی ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔

وہ لکھتا ہے :-

"بدیہی شہادتوں کے پیشِ نظر مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ، ہماری تنظیم، ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گذر رہے ہیں۔ جسم کا کوئی حصہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ ہمارے سارے بدن میں ناسور ہیں۔ ہم اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جس کے ایک طرف ماضی کا حسی تمدن (SENSATE CULTURE) ہے اور دوسری طرف مستقبل کا تصوری تمدن IDEATIONAL (CULTURE) ۔ ہم چھ سو سال گزارنے کے بعد اب زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی بھولی بھٹکی کرنیں اگرچہ دنیا کو منور کر رہی ہیں مگر رات کے تاریک سائے بھی ہر لمحہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس شفق میں جبکہ سورج کی بصارت میں کمی واقع ہو گئی ہے، ہمارے لیے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ تاریک رات نوعِ انسانی کو اپنے ڈراؤنے پردوں میں چھپانے کے لیے منتظر ہے۔ . . . مگر اس تاریکی سے بہت دُور تصوری تمدن کی صبح بھی مستقبل کے انتظار میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔"

فاضل مصنف نے نہایت ہی دیدہ وری کے ساتھ اپنے زمانہ کی خرابیوں اور خامیوں کا احساس کیا ہے۔ اس کی وطن پرستی اندھی نہیں، روشن ضمیر ہے۔ وہ دورِ حاضر کی فنی اور صنعتی ترقی اور سائنس کے کمالات سے خیرہ چشم ہو کر کسی خوش فہمی میں گرفتار نہیں ہوا بلکہ اُس نے اپنی قوتِ تنقید کو بیدار رکھا ہے اور ایکس رے ایکسپرٹ کی طرح فساد کے ان مرکزوں کی نشاندہی کی ہے جو اگرچہ دنیا کی نظروں سے مستور ہیں مگر نوعِ انسانی کے جسم کو بیمار اور اُس کے خون کو گندا کر رہے ہیں۔ اُس کے نزدیک یہ فساد ہمہ گیر ہے اور

زندگی کے رگ و پے میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے۔ لہٰذا دورِ جدید کا سب سے اہم مسئلہ یہ نہیں کہ نظامِ حیات کا ظاہری ڈھانچہ کس شکل کا ہونا چاہیے بلکہ سب سے ضروری سوال یہ ہے کہ فساد کی ان جڑوں کو تبدیل کیا جائے جن سے شر اور فساد کی یہ ساری کونپلیں پھوٹتی اور غذا حاصل کرتی ہیں چنانچہ پروفیسر سارو کن پورے زور سے کہتا ہے:-

"دورِ حاضر کے بحران کی وجہ یہ نہیں کہ اس عہد میں ہٹلر یا مسولینی، سٹالن یا چرچل نے جنم لیا۔ یہ لوگ تو اس بحران کی پیداوار ہیں۔ ان کو دنیا کے سٹیج سے ہٹا دینے سے فساد کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ اُن کے ہٹنے کے ساتھ ہی ان سے زیادہ شریر لوگ ان کی جگہ پر قابض ہو جائیں گے۔ اگر ہم واقعی اصلاحِ حال چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے فکر و نظر کے زاویوں کو بدلنا چاہیے۔ یہ تبدیلی اُسی صورت میں ممکن ہے جبکہ لوگوں میں اپنی تباہی و بربادی کا ایک شدید احساس پیدا ہو کیونکہ یہ احساس ہی لوگوں کو انقلاب کے لیے سرگرمِ عمل کر سکتا ہے۔"

اس کے علاوہ کتاب کا مصنف لوگوں کی اس غلط فہمی کو بھی دُور کرتا ہے جس میں گرفتار ہو کر وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس حسّی تمدن کے علاوہ کوئی دوسری جامع تہذیب نہیں جو انسانیت کو آرام اور سکون بہم پہنچا سکے۔ اُس نے پوری وضاحت سے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس تہذیبِ الحاد کے مقابلہ میں ایک ایسا نظامِ حیات بھی ہے جس کی بنیاد خدا پرستی پر رکھی گئی ہے۔

یورپ میں یہ فکری رجحان صرف فلاسفہ تک ہی محدود نہیں بلکہ عہدِ حاضر کے بیشتر شاعر، افسانہ نگار اور ادیب ایسے ہیں جن کی نگارشات میں یہ چیز پوری طرح نمایاں ہے۔ اور تو اور خود سیاست داں اس نازک صورتِ حالات سے سخت پریشان ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے خاتمہ پر جنگ کے فاتح مسٹر للائڈ جارج نے نہایت ہی اضطراب کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ہماری ساری ترقی، ترقیٔ معکوس ہے اور انسانیت کو سائنس کی قوت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا بلکہ اس نے انسانیت کو بالکل برباد کر دیا ہے۔ چنانچہ اُس نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا:-

"اگر حضرت مسیح اس دنیا میں تشریف لے آئیں تو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے۔ وہ ملاحظہ

یہ فرمائیں گے کہ دو ہزار برس کے بعد بھی انسان فتنہ و فساد، کشت و خون، قتل و غارت میں بدستور مبتلا ہے، بلکہ اس وقت تو انسانیت کے جسم سے تاریخ کی عظیم ترین جنگ کے اثر سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ اور زمین اس قدر تاراج ہو چکی ہے کہ نوبت فاقہ کشی کی آگئی ہے اور حضرت آ کر کیا دیکھیں گے؟ کیا اخوت و مساوات کے ساتھ لوگوں کو ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے دیکھیں گے یا اس کے بالکل برعکس اس جنگِ عظیم سے بڑھ کر مہلک و پُر اذیت جنگ کی تیاریاں کرتے۔ ایک سے ایک بڑھ کر جان لیوا اور ستم کیش آلاتِ ہلاکت ایجاد کرتے اور تعذیب کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے دیکھیں گے۔"

تہذیبِ الحاد کے بارے میں جو چند آراء اوپر پیش کی گئی ہیں، وہ میں مغربی ادب کی سلوٹوں سے ڈھونڈ کر نہیں لایا بلکہ یہ وہ عام رجحان ہے جو یورپ میں بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ آپ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیں اُس میں اسی کا تذکرہ پائیں گے، کسی رسالہ کے اوراق اُلٹیے اُس میں یہی جھلک جھلکتا ہوا نظر آئے گا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اس تمدن کی نامرادی کو پوری طرح وہی لوگ محسوس کر رہے ہیں جو حساس دل رکھتے ہیں، جن میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ہے۔ جو زندگی اور اُس کے مسائل کو محض خود فراموشی سے ذرا ہٹ کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ جن کے کان جنگی فتوحات کے شادیانوں کے علاوہ غریبوں اور مظلوموں کی آہ و فغاں سننے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ باقی رہے عوام تو اُن کو اس تہذیب نے خود فراموشی کے جام پلا پلا کر اتنا بدمست کر دیا ہے کہ انہیں "عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ وہ حسیات اور اس کے لذائذ میں اس قدر گم ہو گئے ہیں کہ اس سے ماوراء انہیں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ مگر ان کے چہروں پر غم و یاس کے نشانات اس حقیقت کے ترجمان ہیں کہ کوئی اُن کے چہروں کی رونق کو لوٹ کر لے گیا ہے، کسی نے انہیں اتنا پاگل بنا دیا ہے کہ وہ خود ہی اپنا گوشت مزے سے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، مگر اپنے دل میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی دوسرے بدن سے حاصل کیا گیا ہے، وہ خود اپنا خون پینے میں گونا گوں لذت محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ عام تاثر اس شخص کا جو

کبھی بھی زندگی کی گہرائیوں میں اُتر کر اُس کا مشاہدہ کیا ہو۔ وہ نہایت آسانی سے اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ مغرب میں انسانیت مادّی وسائل کی فراوانی کے باوجود سخت پریشان ہے۔ سائنس سے جو توقعات اُس نے صدیوں سے وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہیں ہو سکیں۔ یورپ کا ہر فرد اگرچہ اپنے اس اضطراب کا کوئی سائنٹفک تجزیہ کر کے اس کا علاج تو تجویز نہیں کر سکتا مگر اُس کا دل ایک تڑپ محسوس کرتا ہے اور اُس کے لبِ مرگ زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں ع

جگر کی آگ بجھے جس سے وہ شئے لا

یہ سخت بے انصافی ہوگی اگر ہم تہذیبِ مغرب کو سرتا پا باطل قرار دے لیں اور یہ سمجھ لیں کہ اس میں حق، خیر اور افادیت کا سرے سے کوئی عُنصر بھی شامل نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں خالص باطل، شر اور مضرت کا ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ رہنا محال ہے۔ دنیا میں جب کبھی سلبی اقدار پروان چڑھتی ہیں تو وہ اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ اپنے جلو میں چند ایجابی قدروں کو لے کر چلیں جن کے بغیر اُن کا قافلہ ایک قدم بھی بڑھ نہیں سکتا۔ دنیا میں خالص باطل کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، مگر اسے عملی زندگی میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی حال اس تہذیبِ مادیّت کا ہے۔ اس کی عمارت یقیناً غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس میں بلاشبہ بہت سے پہلو مضرت اور شر کے ہیں، جنہوں نے انسانیت کی روح کو سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں کئی جوہر ایسے بھی ہیں جن کی کشش نے لوگوں کو اس کی طرف کھینچا اور وہ اسے اس دنیا میں نافذ کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہوئے۔

جدید یورپ اور اس کے تاریخی پس منظر پر ایک غائر نگاہ ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس تمدن نے انسانیت کی بعض پہلوؤں سے بڑی ہی خدمت کی۔ انسانی عقل کو ایک زوال پذیر مذہب کے بے حس بند صنوں سے نجات دلائی۔ اُسے سوچنے اور سمجھنے پر اُبھارا۔ لوگوں کے دلوں میں اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کے جذبہ کو موجزن کیا اور کلاسیکی سکون آفرینی کے نظریہ کی جگہ حرکت اور حرارت کے اصول کو انسانی زندگی کا رہبر بنا دیا۔ قلب و نگاہ کی اس تبدیلی سے پوری یورپی زندگی

متاثر ہوئی۔ مغربی مفکرین نے تحقیق کے نئے نئے طریقوں کی ایجاد کی، انہوں نے بے جان نظامِ تصورات کو چھوڑ کر حقائقِ اشیاء کی کنہ تک پہنچنے، اور اُن پر تصرف کرنے کا عزم کیا۔ اسی کی بدولت بڑے بڑے انکشافات اور ایجادیں ہوئیں جن سے مغربی دنیا میں زبردست ذہنی اور مادی انقلاب پیدا ہوا۔

مگر عقل کا سیلاب جب ہر قسم کے بند توڑ کر بہہ نکلا تو اس سے اہلِ یورپ کو شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ دنیا میں آج کل جس قدر فکری اور عملی بے راہ روی پائی جاتی ہے، وہ سب عقل کی اسی آزادی کا نتیجہ ہے۔ چونکہ "عقل پرستوں" کی سب سے پہلی جنگ اہلِ مذہب کے خلاف تھی، اس لیے عقل نے مذہب کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے ہوئے یہ فرض کر لیا کہ وہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ مذہب کو دنیا سے یکسر مٹا نہ دے۔ وہ اگر ذرا غور و فکر کرتی تو اُسے یہ بات معلوم ہو جاتی کہ اُس کا اصل دشمن مذہب نہیں بلکہ ایک مخصوص گروہ کا خاص طرزِ استدلال ہے یہ وہ غلط نقطۂ آغاز تھا جہاں سے "اہلِ خرد" نے اپنا سفر شروع کیا اور اس غلط راستہ پر ایک دفعہ پڑ نے کی وجہ سے اُن کے جتنے قدم بھی اُٹھے وہ گمراہی کی طرف ہی اُٹھے اور دو صدیاں گذر جانے کے بعد بھی وہ صحیح سمت دریافت نہ کر سکے۔

عقل و مذہب کی اس باہمی آویزش کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی عقل قوانینِ اخلاق کی محکومی سے آزاد ہو گئی۔ جب مذہب کے بنیادی عقائد ساقط الاعتبار قرار دیئے گئے تو اس کے اخلاقی ضوابط کا اثر بھی آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا۔ اخلاق و مذہب سے بُعد و تنفر جو تاریخی حالات کا پروردہ تھا مغربی ذہن کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے اثرات اس کے ہر شعبۂ تمدن میں نمایاں اور کارفرما ہیں۔ اگرچہ مغربی مفکرین میں سے بعض ہمیشہ اس امر کے دعویدار رہے کہ وہ مذہب اور اُس کے قوانین سے کوئی بغض اور عناد نہیں رکھتے اور وہ صرف طبعی علوم تک "آزادیٔ افکار" کے حامی ہیں، مگر عملی حیثیت سے ایسا نہیں ہے، عقلی بغاوت کے اثرات صرف طبعی علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کا اثر ان علوم پر بھی پڑا جو اجتماعی زندگی اور انسانی معاشرت و تمدن سے براہِ راست متعلق ہیں۔

عقل نے بدقسمتی سے آغاز میں ہی یہ فرض کر لیا کہ وہ زندگی کے ہر گوشہ کے متعلق نہایت کامیاب طریق سے آئین و ضوابط پیش کر سکے گی، مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اُس کے اس بلند دعوےٰ میں ہی اُس کی نامرادی کا راز مضمر ہے۔ انسانی اعمال کے محرکات اور ان کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں کہ انہیں علمِ کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اُسی وقت قائم ہوتی ہے جب کہ ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں سائنس کی بے لوثی کبھی نہیں آ سکتی۔

پھر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ عقل اپنا طبعی فریضہ انجام دینے میں تنہا کافی نہیں، وہ اس بات پر مجبور ہے کہ کام کرتے وقت اپنے سے کمتر چیزوں سے مدد لے۔ یہ سہارے خواہ اُسے کتنے ہی ناپسند ہوں مگر اُس کے لیے بہر حال ضروری اور ان کے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ کھڑی بھی نہیں رہ سکتی تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ کسی ایسی چیز تک پہنچنے میں، جس کو وہ ابھی تک نہیں جانتی، اُسے اُن معلومات پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، جو اس کو پہلے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں۔ تمام معقولات کی تحلیل اور تجزیہ کیجیے، اور عقل کی دلچسپ اور حیرت انگیز مہمات کی داستان سنیے تو معلوم ہوگا کہ حقائق کی ان نئی نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لاعلمی کے ان بڑے بڑے سمندروں کے عبور کرنے میں اس کا ذریعۂ سفر یہی حقیر محسوسات تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ محسوسات ہمیں کہاں سے حاصل ہوتے ہیں، کیا وہ کوئی ریاضی کے تجریدی اصول ہیں، یا وہ اُن تجربات سے عبارت ہیں جو ہمیں ہر صبح اور ہر شام اس آب و گل کی دنیا میں میسّر آتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ تجربات سے مراد ہمارا اسی مادی دنیا میں روزمرہ کا ردِّ عمل ہے۔

وہ انسان جو کسی بلند و بالا ہستی پر ایمان نہیں رکھتا، اور یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کے پیدا کرنے والے نے اس کے لیے ہدایت کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ اور مجرّد عقل کی مدد سے اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی کے لیے اصول وضع کرتا ہے وہ یقیناً اپنے شخصی تجربات سے کام لیگا۔ ان تجربات میں اُس کے

فطری میلانات اور خاندانی و قومی روایات کا جس قدر دخل ہوتا ہے اُس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ وہ عقل جسے اپنی صحت، اپنی غیر جانبداری اور بے تعصبی پر اس قدر ناز تھا وہ عمل کے اعتبار سے انسان کے رجحانات اور اجتماعی ذوق کے ہاتھ میں بے بس کھلونا بن کے رہ جاتی ہے۔

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ انسان کے ذاتی رجحانات اور اجتماعی ذوق کی تعمیر جن بنیادوں پر کی جاتی ہے وہ صرف مادی اور محسوس فوائد یا عارضی اور فوری منافع کا حصول ہے۔ کیونکہ یہی وہ واحد معیار ہے جس پر انسانی عقل تجربہ کی مدد سے اپنی کامیابی کو جانچ سکتی ہے۔ اسی وجہ سے انسان کے لیے جو ضابطۂ اخلاق مرتب ہوا وہ یہ ہے کہ جن افعال سے اُسے انفرادی یا اجتماعی مسرت حاصل ہو، یا دوسرے الفاظ میں مادی لذائذ میں اضافہ ہو وہ خیر ہیں اور جن سے اُن میں کمی واقع ہوتی ہو، وہ شر ہیں۔

اس نظریۂ زندگی نے نہ صرف غرض پسندی کو وجہِ جواز عطا کی، بلکہ اخلاقی زندگی کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ نظامِ اخلاق سارے کا سارا اس مدار پر قائم ہے کہ انسان مادی نفع و نقصان کے خیال سے یکسر بے پروا ہو کر اخلاقی اصولوں کی پابندی محض اس بنا پر کرے کہ وہ ان کی صداقت پر یقین رکھتا ہے۔ لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ انسان کی حسی خواہشات اور اُن کی تکمیل ہی مدارِ زیست ہے، اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے جو طریق بھی اختیار کر لیا جائے وہی عین حق اور صداقت ہے، تو اس سے لازمی طور پر سوسائٹی کا استحکام ختم ہو گا، اور ایک سیمابی کیفیت پیدا ہو گی۔ مغربی اقوام میں گذشتہ سو سال سے باہمی پیکار و تصادم کا جو بازار گرم ہے وہ اسی خالص غرض پرستی کا نتیجہ ہے۔

پھر اس فلسفۂ حیات نے انسانی فلاح کا بھی بالکل ایک نیا طریقہ رائج کیا۔ مغربی تہذیب سے پیشتر جب مذہب کی کچھ اقدار باقی تھیں، اور انسان کسی نہ کسی طور پر ان کے زیرِ اثر تھا تو وہ تمدنی یا معاشرتی بہبود کے لیے انسان کے نفسی اور باطنی محرکات کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر جب سے نیا انسان حسیات پر ایمان لایا ہے اُس کے طرزِ اصلاح میں یکسر تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اب یہ سمجھنے لگا ہے کہ صرف خارج میں کچھ تغیرات پیدا کر لینے کے بعد انسان کی پوری زندگی تبدیل کی جا سکتی ہے۔ یہ

صحیح ہے کہ خارجی نظامات مثلاً نظامِ حکومت یا نظامِ معیشت انسانی کردار و افعال پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات پیدا کرتے ہیں لیکن جب تک انسانی ضمیر اور انسان کے باطنی محرکات میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو خارجی احوال کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ اصل اور حقیقی انقلاب اسی وقت رونما ہوتا ہے جب زندگی کے متعلق انسان کا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر بدل جائے۔

پچھلے صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ دراصل نہایت ہی مختصر الفاظ میں نقشہ ہے اس فلسفۂ زندگی کا جس پر یورپی تہذیب کی عمارت اُٹھائی گئی ہے۔ اب ہم چند مثالوں کے ذریعہ سے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ کس طرح یہ نظریۂ حیات مختلف تحریکات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا، اور وہ کیونکر انسانیت کو حقیقی فلاح سے ہمکنار کرنے میں ناکام رہا۔

انسانی تمدّن کا ہمیشہ سے یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ رہا ہے کہ فرد اور جماعت کے تعلق کی نوعیت کیا ہو۔ آیا فرد جماعت میں اپنی انفرادیت ضم کر دے یا وہ جماعت کو اپنے استحکام اور بقا کے لیے استعمال کرے۔

صنعتی انقلاب کے بعد جب بھاپ کے دیو کو مسخّر کر لینے کی وجہ سے انسان کے ہاتھ میں بے پناہ قوت آگئی، تو اب اس کے سامنے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اس قوت اور طاقت کو کس طرح استعمال میں لایا جائے۔ بدقسمتی سے یہی وہ زمانہ تھا جب اہلِ مغرب مذہب کو بالکل پس پشت ڈال چکے تھے اور اس کا کوئی معمولی سے معمولی اثر اُن کے دل یا دماغ پر موجود نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس قوت اور طاقت سے صرف اپنے استحکام کے لیے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی اور وجود کا مقصد صرف یہی سمجھا کہ وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد سمیٹیں، خواہ اُن کے اس عمل سے دوسرے انسان کو کتنا عظیم نقصان برداشت کرنا پڑے۔ اسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے جاذبِ نظر اور دلکش فلسفے گھڑے گئے۔ نظامِ حکومت، نظامِ معیشت اور نظامِ معاشرت اسی کے مطابق ڈھالے گئے۔ سرمایہ داری نظام اس نظریۂ حیات کا مظہرِ اتم ہے۔

یہ فلسفۂ حیات اتنا کمزور اور یک رُخا ہے کہ اس پر کسی اجتماعی زندگی کی مستقل طور پر تعمیر نہیں کی جا سکتی

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چند سالوں ہی میں ایک خاص طبقے نے پوری کی پوری قوم کو قلاش اور مفلس بنا کر رکھ دیا۔ عوام کی محنت، ذہانت و طباعی کو ایسے کاموں پر لگا یا گیا جن سے اس گروہ کو فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ قوم کی ساری صلاحیتیں اور قوتیں صرف اسی کی چاکری میں صرف ہونے لگیں۔

اس نظریۂ حیات پر ایمان رکھنے والے انسانوں کے اندر اگر وسعت نظر بھی پیدا ہوئی تو وہ اپنے قومی اور ملکی حدود کو پھاند نہ سکی۔ قوم کے نچلے اور کمزور طبقوں کو نہایت عیاری سے یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ وطن کی عزت و حرمت اور اس کی بڑائی ہی اعلیٰ ترین اخلاقی قدر ہے۔ اُن کی زندگی کی غایتِ اولیٰ یہ ہونی چاہیے کہ وہ اخلاق کے پورے نظام کو اس قدرِ اعلیٰ کا محکوم و تابع بنا دیں۔ خاکِ وطن کے سامنے سربسجود ہوں اور اسی "ربِ عظیم" کے حضور میں ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی پیش کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہر لحظہ تیار رکھیں۔ قومی لیڈر خواہ اپنی انفرادی زندگی میں کیسے ہی بدکردار اور دوسری قوموں کے لیے کتنے ہی ظالم اور سفاک ہوں اس دین کے ائمہ و صلحا ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس تصورِ حیات کے ساتھ کوئی پائیدار اور اخلاقی نظام کبھی میل نہیں کھا سکتا۔ درحقیقت قوم پرستی کا وجود ہی قانون اور اخلاق کی نفی ہے۔ یہاں اپنی قوم کے مفاد کی خاطر دوسری اقوام کے مفاد کو قربان کرنا، قومی منافع کے حصول کی غرض سے اوروں کو تباہ و برباد کرنا، اور پھر اپنے کیے پر بجائے اظہارِ ندامت کرنے کے، گونا گوں لذت اور راحت محسوس کرنا، یہ سب خصوصیات قوم پرستی کی اولیں بنیادیں ہیں۔ اسی سے فریب، مکر و زور اور دیگر اخلاقی معائب جنہیں خود ایک قوم کے افراد باہمی معاملات میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، قومی اور ملکی مفاد کی حمایت اور دوسری اقوام کے مقابلہ میں جائز ٹھہرائے جاتے ہیں۔ پچھلے دو سو سال میں انسانیت کو جو جو اذیتیں پہنچی ہیں اُن میں زیادہ دخل اسی تصور کا ہے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

قانون سازی، شوریٰ اور اجماع

سوال:۔ اسلام میں قانون سازی کی حقیقت و ماہیت اور اس کے دائرہ عمل کے تعین میں بہت افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے ۔ ایک طرف یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام میں قانون سازی کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے ۔ قانون اللہ اور اس کے رسول نے بنا دیا ہے ۔ مسلمانوں کا کام اس پر عمل کرنا اور اسے نافذ کرنا ہے ۔ دوسری طرف اب کچھ لوگوں کے نزدیک قانون سازی کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو اس بات کا بھی حق دے دیا گیا ہے کہ وہ عبادات سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ تفصیلات تک میں ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں مثلاً وہ نماز اور روزہ کی عملی شکلوں میں بھی حذف و اضافہ کر سکتے ہیں۔

براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں کہ اسلام میں قانون سازی کے حدود اور اس کی مختلف نوعیتیں کیا کیا ہیں ۔ نیز اسے بھی صاف کریں کہ خلفاء کے انفرادی اور شورائی فیصلوں اور ائمہ فقہا و مجتہدین کی آرا کی قانونی حیثیت کیا ہے ۔ اس سلسلے میں اگر شوریٰ اور اجماع کی حقیقت پر بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے تو مناسب ہے۔

جواب ۔ اسلام میں دائرہ عبادات کے اندر قانون سازی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے البتہ عبادات کے علاوہ معاملات کے اُس دائرے میں قانون سازی کی گنجائش موجود ہے جس میں کتاب و سنت خاموش ہے ۔ اسلام میں قانون سازی کی بنیاد یہ اصول ہے کہ عبادات میں صرف وہی عمل کرو جو بتا دیا گیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نیا طریقۂ عبادت ایجاد نہ کرو ، اور معاملات میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے

اس کے پابند رہو۔ جس چیز سے روک دیا گیا ہے اس سے رک جاؤ اور جس چیز کے بارے میں شارع (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) نے سکوت اختیار کیا ہے اس میں تم اپنی صوابدید کے مطابق کرنے کے لیے آزاد ہو۔" امام شاطبی نے اپنی کتاب "الاعتصام" میں اس اصول کو یوں بیان کیا ہے:

"عبادات کا حکم عادات کے حکم سے مختلف ہے۔ عادات میں قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے اس میں گویا اپنی صوابدید پہ کام کرنے کا اذن دے دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے عبادات میں کوئی ایسی بات استنباط سے نہیں نکالی جا سکتی جس کی اصل شرع میں موجود نہ ہو، کیونکہ عادات کے برعکس عبادات کا سررشتہ حکم صریح اور اذن صریح سے بندھا ہوا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عادیات میں فی الجملہ ہماری عقلیں راہِ صواب معلوم کر سکتی ہیں اور عبادات میں ہم خود عقل سے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ اللہ سے تقرب کا راستہ کونسا ہے۔" (جلد دوم، صفحہ ۱۱۵)

معاملات میں قانون سازی کے چار شعبے ہیں:

الف۔ تعبیر، یعنی جن معاملات میں شارع نے امر یا نہی کی تصریح کی ہے ان کے بارے میں نص کے معنی یا ان کا منشا متعین کرنا۔

ب۔ قیاس، یعنی جن معاملات میں شارع کا کوئی براہِ راست حکم نہیں ہے، مگر جن سے ملتے جلتے معاملات میں حکم موجود ہے، ان میں علتِ حکم مشخص کر کے اس حکم کو اس بنیاد پر جاری کرنا کہ یہاں بھی وہی علت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر یہ حکم اس سے مماثل واقعہ میں دیا گیا تھا۔

ج۔ استنباط و اجتہاد، یعنی شریعت کے بیان کردہ وسیع اصولوں کو جزوی مسائل و معاملات پر منطبق کرنا اور نصوص کے اشارات، دلالتوں اور اقتضاءات کو سمجھ کر یہ معلوم کرنا کہ شارع ہمارے زندگی کے معاملات کو کس شکل میں ڈھالنا چاہتا ہے۔

د۔ جن معاملات میں شارع نے کوئی ہدایت نہیں دی ہے ان میں اسلام کے وسیع مقاصد اور مصالح کو ملحوظ رکھ کر ایسے قوانین بنانا جو ضرورت کو بھی پورا کریں اور ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعی نظام کی

روح اور اس کے مزاج کے خلاف بھی نہ ہوں۔ اس چیز کو فقہاء نے "مصالح مرسلہ" اور "استحسان" وغیرہ ناموں سے موسوم کیا ہے۔ مصالح مرسلہ کے معنی ہیں "وہ عمومی مصلحتیں جن کو ہماری صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے" اور استحسان سے مراد یہ ہے کہ ایک معاملہ میں بظاہر قیاس تو ایک حکم لگاتا ہے، مگر عظیم تر دینی مصلحتیں ایک دوسرے حکم کا تقاضا کرتی ہیں، اس لیے پہلے حکم کے بجائے دوسرے حکم کو ترجیح دیکر جاری کیا جائے۔

(۴) تعبیر، قیاس اور استنباط کے لیے تو کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے، البتہ مصالح مرسلہ اور استحسان پر ہم کچھ مزید روشنی ڈالیں گے۔ امام شاطبی نے اپنی کتاب "الاعتصام" میں اس موضوع پر ایک مستقل باب لکھا ہے اور اس کی ایسی نفیس تشریح کی ہے جس سے بہتر اصول فقہ کی کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ اس میں وہ مفصل دلائل دے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ مصالح مرسلہ سے مراد قانون سازی کی بالکل کھلی چھوٹ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس کے لیے تین شرطیں لازم ہیں :-

اول یہ کہ جو قانون اس طریقہ پر بنایا جائے وہ مقاصد شریعت کے مطابق ہو نہ کہ ان کے خلاف۔

دوم یہ کہ جب وہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو عام عقلیں اس کو قبول کریں،
تیسرے یہ کہ وہ کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے، یا کسی حقیقی مشکل کو رفع کرنے کے لیے ہو۔ (الاعتصام جلد دوم صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۴)

پھر وہ استحسان پر بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اگر بظاہر کسی دلیل کی بنا پر قیاس یہ چاہتا ہو کہ ایک معاملہ میں ایک خاص حکم لگایا جائے، مگر فقیہ کی نگاہ میں وہ حکم مصلحت کے خلاف ہو، یا اس سے کوئی ایسا نقصان یا حرج لازم آتا ہو جو اسلامی نقطۂ نظر سے رفع کرنے کے لائق ہے، یا وہ عرف کے خلاف ہو، تو اُسے چھوڑ کر دوسرا مناسب حکم لگا دینا استحسان ہے۔ بہر حال استحسان کے لیے شرط یہ ہے کہ ظاہر قیاس کو چھوڑ کر خلاف قیاس حکم لگانے کے لیے کوئی قوی ترجیح

ہونی چاہیے جسے معقول دلائل کے ساتھ قابلِ لحاظ ثابت کیا جا سکے (جلد دوم، صفحہ ۱۱۸-۱۱۹)

(۴) ان چاروں شعبوں کے متعلق کسی مجتہد یا امام کی انفرادی رائے اور تحقیق ایک ماہرانہ رائے اور تحقیق تو ہو سکتی ہے، جس کا وزن رائے دینے والے کی علمی شخصیت کے وزن کے مطابق ہی ہوگا، مگر بہرحال وہ "قانون" نہیں بن سکتی۔ قانون بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مملکتِ اسلامیہ کے اربابِ حل و عقد کی شوریٰ ہو اور وہ اپنے اجماع سے یا جمہوری فیصلے (یعنی اکثریت کے فیصلے) سے ایک تعبیر، ایک قیاس، ایک استنباط و اجتہاد، یا ایک استحسان و مصلحتِ مرسلہ کو اختیار کر کے قانون کی شکل دے دیں۔ خلافتِ راشدہ میں قانون سازی کی یہی شکل تھی۔ اس کی تشریح میں اپنے پمفلٹ "اسلامی دستور کی تدوین" میں کر چکا ہوں، لہٰذا یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ براہِ کرم اسے صفحہ ۲۶ سے ۳۰ تک، صفحہ ۳۵ سے ۳۸ تک، صفحہ ۴۰ سے ۵۱ تک، اور صفحہ ۵۴ سے ۵۷ تک ملاحظہ فرما لیا جائے۔ یہاں میں صرف چند مثالیں دینے پر اکتفا کروں گا، جن سے اندازہ ہو گا کہ خلافتِ راشدہ میں قومی و ملی ضرورتیں پیش آنے پر قانون سازی کس طرح ہوتی تھی، اور اُس دَور میں "قانون" اور عدالتی فیصلوں کے درمیان کیا فرق تھا۔

الف۔ شراب کے متعلق قرآن میں صرف حرمت کا حکم دیا گیا ہے، اس کے لیے سزا کی کوئی "حد" مقرر نہیں کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کے لیے کوئی خاص سزا مقرر نہیں کی گئی، بلکہ آپ جس کو جیسی سزا مناسب سمجھتے تھے دے دیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنے زمانے میں ۴۰ کوڑوں کی سزا دی، لیکن اس کے لیے کوئی باقاعدہ قانون نہیں بنایا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب شراب نوشی کی شکایات زیادہ بڑھیں تو انہوں نے صحابہ کی مجلسِ شوریٰ میں معاملہ پیش کیا۔ حضرت علیؓ نے ایک مختصر تقریر میں تجویز پیش کی کہ اس کے لیے ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کر دی جائے۔ شوریٰ نے اس سے اتفاق کیا اور یہ آئندہ کے لیے بھی قانون "اجماع" کے ساتھ بنا دیا گیا۔ (الاعتصام، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱)

ب۔ خلفاء راشدین کے زمانہ میں یہ قانون بھی بنایا گیا کہ کاریگروں کو اگر کوئی چیز بنانے کے لیے دی جائے (مثلاً کپڑا سینے کے لیے یا سونا زیور بنانے کے لیے)، اور وہ ضائع ہو جائے، تو انہیں اس کی قیمت کا تاوان دینا ہوگا۔ یہ فیصلہ بھی حضرت علیؓ کی اس تقریر پر ہوا کہ اگرچہ کاریگر کو ایسی صورت میں بظاہر قابلِ الزام قرار

نہیں دیا جا سکتا جبکہ چیز کے ضائع ہونے میں اس کی غفلت کا دخل نہ ہو، لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ کاریگر لوگوں کی چیزوں کی حفاظت کرنے میں غفلت برتنے لگیں گے۔ اس لیے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں ضامن قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ بھی اجماع سے ہوا۔ (ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۱۰۲)

ج۔ حضرت عمرؓ نے اس امر کا فیصلہ کیا کہ اگر ایک آدمی کے قتل میں چند آدمیوں نے شرکت کی ہو تو سب سے قصاص لیا جائے۔ امام مالک اور شافعی نے اس فیصلے کو قبول کیا ہے، مگر اس کو "قانون" کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ ایک عدالتی فیصلہ تھا، شوریٰ میں اجماع سے یا جمہوری رائے سے قانون نہیں بنایا گیا تھا۔ (ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۱۰۷)

د۔ مفقود الخبر کی بیوی اگر عدالت کی اجازت سے نکاح ثانی کر چکی ہو اور پھر اس کا سابق شوہر آ جائے تو آیا وہ پہلے شوہر کو ملے گی یا دوسرے شوہر کے پاس رہے گی؟ اس مسئلے میں خلفائے راشدین نے مختلف فیصلے کیے ہیں، مگر کسی فیصلے کو بھی "قانون" کی حیثیت حاصل نہیں ہے، کیونکہ اس مسئلے کو شوریٰ میں پیش کر کے اجماع سے یا جمہور کی رائے سے کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ (ایضاً ج ۲، ص ۱۲۶)

(۴) مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عدالتی فیصلوں کی وہ حیثیت نہیں ہے جو انگریزی قانون میں ہے۔ انگریزی قانون میں ججوں کے فیصلوں کی نظیریں "قانون" کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں، مگر اسلام میں اگرچہ ایک جج کا وہ فیصلہ نافذ ضرور ہو گا جو اس نے کسی مقدمے میں نص کی ایک تعبیر اختیار کر کے، یا اپنے قیاس یا اجتہاد سے کیا ہو، لیکن اس کو ایک مستقل "قانون" کی حیثیت حاصل نہ ہو گی۔ بلکہ ایک ہی جج ایک مقدمہ میں ایک فیصلہ دینے کے بعد ہمیشہ کے لیے اپنے اس فیصلے کا پابند نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد اسی سے ملتے جلتے دوسرے مقدمے میں وہ دوسرا فیصلہ دے سکتا ہے اگر اس پر اپنی پچھلی رائے کی غلطی واضح ہو چکی ہو۔

(۵) خلافت راشدہ کے بعد جب شوریٰ کا نظام درہم برہم ہو گیا تو ائمہ مجتہدین نے جو فقہ کے مختلف نظام مرتب کیے ان کو نیم قانونی حیثیت اس بنا پر حاصل ہو گئی کہ ایک علاقے کے باشندوں کی عظیم اکثریت نے کسی ایک امام کی فقہ کو قبول کر لیا۔ مثلاً عراق میں امام ابو حنیفہ کی فقہ، یا اندلس میں امام مالکؒ کی فقہ،

یا مصر میں امام شافعی کی فقہ وغیرہ۔ لیکن اس قبولیتِ عام نے کہیں بھی کسی فقہ کو صحیح معنوں میں "قانون" نہیں بنا دیا۔ وہ قانون جہاں بھی بنی ہے اس بنا پر بنی ہے کہ ملک کی حکومت نے اسے بطورِ قانون تسلیم کر لیا۔

اجماع کی تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اجماع اس چیز کا نام ہے کہ "ایک مسئلے میں تمام اہلِ علم متفق ہوں اور کوئی ایک قول بھی اس کے خلاف نہ پایا جاتا ہو"۔ ابن جریر طبری اور ابوبکر رازی کی اصطلاح میں اکثریت کا قول بھی "اجماع" ہے۔ امام احمدؒ جب کسی مسئلے میں یہ کہتے ہیں کہ "ہمارے علم میں اس کے خلاف کوئی قول نہیں ہے" تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ امام موصوف کے نزدیک اس مسئلے میں اجماع ہے۔

یہ امر سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ "اجماع" حجت ہے یعنی نص کی جس تعبیر پر، یا جس قیاس و اجتہاد پر، یا جس قانونِ مصلحت پر اجماعِ امت ہو گیا ہو اس کی پیروی لازم ہے لیکن اختلاف جس امر میں ہے وہ اجماع کا وقوع و ثبوت ہے نہ کہ بجائے خود اجماع کا حجت ہونا۔ جہاں تک خلافتِ راشدہ کے دور کا تعلق ہے، چونکہ اُس زمانے میں اسلامی نظامِ جماعت باقاعدہ قائم تھا اور شوریٰ پر نظام چل رہا تھا، اس لیے اُس وقت کے اجماعی اور جمہوری فیصلے تو معلوم اور معتبر روایات سے ثابت ہیں لیکن بعد کے دور میں جب نظامِ جماعت درہم برہم اور شوریٰ کا طریقہ ختم ہو گیا تو یہ معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا کہ کس چیز پر فی الحقیقت اجماع ہے اور کس چیز پر نہیں ہے۔ اسی بنا پر خلافتِ راشدہ کے دور کا اجماع تو ناقابلِ انکار مانا جاتا ہے، مگر بعد کے دور میں جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں مسئلے پر اجماع ہے تو محققین اس کے اس دعوے کو رد کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کس بات پر اجماع ہے اور کس بات پر نہیں ہے اسلامی نظام کا قیام ضروری ہے۔

عام طور پر جو یہ مشہور رہے کہ امام شافعیؒ یا امام احمد ابن حنبلؒ سرے سے اجماع کے وجود ہی کے منکر تھے، یا کسی دوسرے امام نے اس کا انکار کیا ہے، یہ سب کچھ اُس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُس پر اجماع ہے، درآنحالیکہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہ ہوتا، تو یہ لوگ

اس کے اس دعوے کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "جماع العلم" میں اس مسئلے پر مفصل بحث کر کے یہ بتایا ہے کہ دنیائے اسلام کے پھیل جانے اور جگہ جگہ اہل علم کے منتشر ہو جانے اور نظامِ جماعت درہم برہم ہو جانے کے بعد اب کسی جزوی مسئلے کے متعلق یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس میں تمام علماء کے اقوال کیا ہیں۔ اس لیے جزئیات میں اب اجماع کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔ البتہ اسلام کے اصولوں اور اس کے ارکان اور بڑے بڑے مسائل کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان پر اجماع ہے، مثلاً یہ کہ نماز کے اوقات پانچ ہیں، یا روزے کے حدود یہ ہیں وغیرہ۔ اسی بات کو امام ابن تیمیہؒ یوں بیان کرتے ہیں :-

"اجماع کے معنی یہ ہیں کہ کسی حکم پر تمام علماء مسلمین متفق ہو جائیں۔ اور جب کسی حکم پر تمام امت کا اجماع ثابت ہو جائے تو کسی شخص کو اس سے نکلنے کا حق نہیں رہتا، کیونکہ پوری امت کبھی ضلالت پر متفق نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان میں اجماع ہے حالانکہ دراصل وہ نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات دوسرا قول راجح ہوتا ہے۔" (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱ صفحہ ۴۰۶)

مذکورۂ بالا تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلے میں نصِ شرع کی کسی تعبیر پر، یا کسی قیاس یا استنباط پر، یا کسی تدبیر و مصلحت پر اب بھی اہل حل و عقد کا اجماع، یا ان کی اکثریت کا فیصلہ فی الواقع ہو جائے تو وہ حجت ہو گا اور قانون قرار پائے گا۔ اس طرح کا فیصلہ اگر تمام دنیائے اسلام کے اہل حل و عقد کریں تو وہ تمام دنیائے اسلام کے لیے قانون ہو گا اور کسی ایک اسلامی مملکت کے اہل حل و عقد کریں تو وہ کم از کم اس مملکت کے لیے تو قانون ہونا چاہیے۔

اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق

سوال۔ اپریل کے ترجمان میں شائع شدہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے ایک مضمون میں سے

ایک عبارت ، رمضان کے طلوع اسلام میں نقل کی گئی ہے۔ عبارت یہ ہے "جس طرح اللہ اور اُس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی، اسی طرح اسلام میں کتاب اور سنت کے درمیان کسی تفریق کی گنجائش نہیں " مولانا اصلاحی صاحب کو خطاب کر کے اس عبارت کے بارے میں طلوع اسلام نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں یہ تو آیا ہے کہ ایک رسول اور دوسرے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی لیکن یہ کہیں نہیں آیا کہ اللہ اور اُس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی . . . . عبد اور معبود میں فرق نہ کرنا کھلا ہوا شرک ہے۔ کیا آپ فرمائیں گے کہ آپ کے پاس یہ کہنے کی کیا سند ہے "

اس میں شک نہیں کہ مولانا کے جملے کے سیاق و سباق سے یہ بات نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول میں یہ عدم تفریق ان کے مطاع اور شارع ہونے کی حیثیت سے ہے۔ تاہم اگر ترجمان میں اس کے مفہوم کی مزید وضاحت کر دی جائے تو بہتر ہے۔

جواب ۔ جو آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنا چاہے اور اس کے درپے رہے اس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔ خود قرآن اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اصحاب زیغ کتاب اللہ کی آیات سے بھی کجی نکالنے اور کج بحثی کرنے سے باز نہیں رہ سکتے تو انسان کے کج بیان کے کلام میں سے کفر و شرک کا برآمد کر لینا ایسے لوگوں کے لیے کیا مشکل ہے۔ بہرکیف ان لوگوں کے جواب میں نہیں، بلکہ آپ کے اطمینان کی خاطر تھوڑی سی مزید وضاحت کی جا رہی ہے۔

" تفریق بین اللہ و رسلہ" و " تفریق بین الرسل" یعنی اللہ اور اس کے رسولوں کے مابین تفریق اور ایک رسول اور دوسرے رسول کے مابین تفریق قرآن مجید کی مخصوص اصطلاحات ہیں جن کی وضاحت خود قرآن ہی نے کر دی ہے۔ جس شخص نے خدا سے ڈر کر اور سوچ سمجھ کر پورا قرآن ایک مرتبہ بھی پڑھا ہو وہ ان اصطلاحات کے صحیح اور قرآنی مفہوم سے نابلد نہیں رہ سکتا۔ اللہ اور اُس کے رسول کے درمیان تفریق سے مراد یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کا، اس کی اطاعت کرنے کا اور اُس کے حکم کو دینی ماخذ و حجت تسلیم کرنے کا دعویٰ تو کیا جائے مگر رسول پر نہ ایمان لایا جائے، نہ اس کی اطاعت کا عہد کیا جائے اور نہ اُس کے حکم کو دینی ماخذ و حجت تسلیم کیا جائے۔ اللہ اور اس کے رسول میں تفریق سے مراد یہ نہیں کہ ایک کی ذات کو دوسرے

کی ذات سے الگ سمجھا جائے۔ اس کے برعکس اللہ اور اس کے رسول میں عدمِ تفریق سے مراد یہ ہے کہ دونوں پر ایمان لایا جائے، دونوں کی اطاعت کی جائے اور دونوں کے حکم کو دینی مأخذ و حجت مانا جائے۔ اللہ اور رسول میں عدمِ تفریق سے مراد یہ نہیں کہ ایک کی ذات کو دوسرے کی ذات سے ممتاز نہ سمجھا جائے اور عبد و معبود میں کوئی فرق نہ کیا جائے۔ یہ تفریق یا عدمِ تفریق اللہ اور رسول کی ذاتی حیثیات میں نہیں بلکہ ان کے واجب الایمان اور واجب الاطاعت ہونے کی حیثیت سے ہے۔

اسی طرح سے تفریق بین الرسل سے مراد یہ ہے کہ سلسلۂ رسالت میں سے چند ایک یا کسی ایک رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ کیا جائے لیکن دوسرے رسول یا رسولوں پر ایمان نہ لایا جائے۔ تفریق بین الرسل سے بھی یہ مراد نہیں کہ ان کی شخصی حیثیتوں میں امتیاز تسلیم کیا جائے۔ اس طرح کے امتیاز سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فضیلت بھی منصبِ رسالت کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ ذاتی خصائص و امتیازات کے لحاظ سے ہے جس کی وضاحت ساتھ ہی کر دی گئی ہے۔ اس کے برخلاف رسولوں میں عدمِ تفریق سے مراد یہ ہے کہ سب پر ایمان لایا جائے۔ اس عدمِ تفریق کا مدعا بھی یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کی ذاتی حیثیات میں امتیاز کو نہ مانا جائے۔

قرآن مجید نے عدمِ تفریق بین اللہ و بین رُسُلِہٖ نیز عدمِ تفریق بین الرسل کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے اور تفریق بین اللہ و رُسُلِہٖ نیز تفریق بین الرسل کو کفر کی علامت قرار دیا ہے۔ آپ طلوعِ اسلام کے اس خیال کو بیں کہ قرآن کریم میں یہ تو آیا ہے کہ ایک رسول اور دوسرے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی لیکن یہ کہیں نہیں آیا کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی اور پھر ان آیات کو پڑھیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ	بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں
وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَ	اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کریں اور
یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ	کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض سے کفر
اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا۔ اُولٰٓئِکَ	کرتے ہیں اور اس کے درمیان کا کوئی راستہ پکڑنا چاہتے

هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا - وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (نساء: ۲۱)

ہیں۔ یہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں پر اور ان میں سے کسی بیچ تفریق نہیں کی، یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ اجر دیگا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے کیا وہ مولانا اصلاحی کی منقولہ عبارت کی صاف صاف تائید اور طلوعِ اسلام کے مذکورۂ بالا اعتراض کی پوری پوری تردید نہیں کر رہا؟ احادیث پر دست درازی کرتے کرتے کیا اب اتنی چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی پیدا ہو گئی ہے کہ قرآن پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا گیا ہے؟ یا پھر کہیں اس آیت سے اعراض کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ اس کے آئینے میں "طلوعِ اسلام" کو اپنی یا اپنے سے ملتی جلتی تصویر نظر آ رہی ہے؟

اعلان

دفتر ترجمان القرآن میں پچھلے سالوں کے چند پرچے برائے فروخت موجود ہیں۔ شائقین کی سہولت کے لیے ان کی قیمت میں پچاس فیصدی رعایت کر دی گئی ہے۔ فائل رکھنے کے خواہشمند حضرات فوری توجہ فرمائیں۔

۱۔ رجب ۱۳۶۶ھ ۔ مطابق جون ۱۹۴۷ء ۔ جلد ۳۱ ، عدد ۱
۲۔ شعبان ۱۳۶۶ھ ۔ مطابق جون ۱۹۴۷ء ″ ″ ۲
۳۔ رمضان ۱۳۶۶ھ ۔ ″ جولائی ۱۹۴۷ء ″ ″ ۳
۴۔ شوال ۱۳۶۶ھ ۔ مطابق اگست ۱۹۴۷ء ″ ″ عدد ۴

۵ - ذی القعدہ سنہ ۶۷ھ - مطابق ستمبر سنہ ۴۸ء - جلد ۳۱ - عدد ۵

۶ - رجب و شعبان سنہ ۶۸ھ ″ جون و جولائی سنہ ۴۹ء - جلد ۳۲ - عدد ۱، ۲

۷ - رمضان سنہ ۶۸ھ ″ اگست سنہ ۴۹ء ″ ″ عدد ۳

۸ - شوال سنہ ۶۸ھ ″ ستمبر سنہ ۴۹ء ″ ″ ″ ۴

۹ - ذی الحجہ سنہ ۶۸ھ ″ نومبر سنہ ۴۹ء ″ ″ ″ ۶

۱۰ - محرم، صفر، ربیع الاول سنہ ۶۹ھ مطابق دسمبر، جنوری سنہ ۴۹-۵۰ء جلد ۳۳ عدد ۱، ۲، ۳

۱۱ - ربیع الثانی سنہ ۶۹ھ ″ مارچ سنہ ۵۰ء ″ ″ ″ ۴

۱۲ - جمادی الاول سنہ ۶۹ھ ″ اپریل سنہ ۵۰ء ″ ″ ″ ۵

۱۳ - جمادی الثانی سنہ ۶۹ھ ″ مئی سنہ ۵۰ء ″ ″ ″ ۶

۱۴ - رجب سنہ ۶۹ھ ″ جون سنہ ۵۰ء جلد ۳۴ ″ ۱

۱۵ - شعبان، رمضان، شوال، ذی القعدہ سنہ ۶۹ھ - جولائی تا ستمبر سنہ ۵۰ء ″ ″ ″ ۲، ۳، ۴، ۵

۱۶ - ذی الحج سنہ ۶۹ھ مطابق اکتوبر سنہ ۵۰ء ″ ″ ″ ۶

۱۷ - محرم سنہ ۷۰ھ ″ نومبر سنہ ۵۰ء جلد ۳۵ عدد ۱

۱۸ - صفر سنہ ۷۰ھ ″ دسمبر سنہ ۵۰ء ″ ″ ″ ۲

۱۹ - ربیع الاول، ربیع الثانی سنہ ۷۰ھ ″ جنوری، فروری سنہ ۵۱ء ″ ″ ″ ۳، ۴

۲۰ - جمادی الاول، جمادی الثانی سنہ ۷۰ھ ″ مارچ، اپریل سنہ ۵۱ء ″ ″ ″ ۵-۶-۱

۲۱ - شعبان سنہ ۷۰ھ ″ جون سنہ ۵۱ء جلد ۳۶ عدد ۲

۲۲ - شوال سنہ ۷۰ھ ″ اگست سنہ ۵۱ء ″ ″ عدد ۴

۲۳ - ذی القعدہ، ذی الحجہ سنہ ۷۰ھ ″ ستمبر سنہ ۵۱ء ″ ″ ″ ۵-۶

۲۴ - محرم سنہ ۷۱ھ ″ اکتوبر سنہ ۵۱ء جلد ۳۷ عدد ۱

۲۵ - صفر سنہ ۷۱ھ ″ نومبر سنہ ۵۱ء ″ ″ ″ ۲

۲۶ - رجب، شعبان سنہ ۱۳۷۱ھ - مطابق اپریل، مئی سنہ ۱۹۵۲ء - جلد ۳۸ عدد ۱، ۲

۲۷ - رمضان، شوال سنہ ۱۳۷۱ھ " جون، جولائی سنہ ۱۹۵۲ء - " " " ۳، ۴

۲۸ - ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۱ھ " ستمبر سنہ ۱۹۵۲ء " " " ۶

۲۹ - ربیع الاول سنہ ۱۳۷۲ھ " دسمبر سنہ ۱۹۵۲ء - جلد ۳۹ عدد ۳

۳۰ - جمادی الثانی تا رمضان سنہ ۱۳۷۲ھ - مارچ تا جون سنہ ۱۹۵۳ء جلد ۳۹، ۴۰ عدد ۶؛ ۱، ۲

۳۱ - شوال، ذی القعدہ سنہ ۱۳۷۲ھ " جولائی، اگست سنہ ۱۹۵۳ء جلد ۴۰ عدد ۴، ۵

۳۲ - ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۲ھ " ستمبر سنہ ۱۹۵۳ء " " عدد ۶

۳۳ - محرم سنہ ۱۳۷۳ھ " اکتوبر سنہ ۱۹۵۳ء جلد ۴۱ عدد ۱

۳۴ - صفر سنہ ۱۳۷۳ھ " نومبر سنہ ۱۹۵۳ء جلد " عدد ۲

۳۵ - ربیع الاول سنہ ۱۳۷۳ھ " دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء " " عدد ۳

۳۶ - جمادی الثانی سنہ ۱۳۷۳ھ " مارچ سنہ ۱۹۵۴ء " " " ۶

۳۷ - رجب سنہ ۱۳۷۳ھ " اپریل سنہ ۱۹۵۴ء جلد ۴۲ " ۱

۳۸ - شعبان سنہ ۱۳۷۳ھ " مئی سنہ ۱۹۵۴ء " " " ۲

۳۹ - شوال سنہ ۱۳۷۳ھ " جولائی سنہ ۱۹۵۴ء " " " ۴

۴۰ - ذی القعدہ سنہ ۱۳۷۳ھ " اگست سنہ ۱۹۵۴ء " " " ۵

۴۱ - ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۳ھ " ستمبر سنہ ۱۹۵۴ء " " عدد ۶

۴۲ - محرم سنہ ۱۳۷۴ھ " اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء جلد ۴۳ عدد ۱

۴۳ - صفر سنہ ۱۳۷۴ھ " نومبر سنہ ۱۹۵۴ء " " " ۲

ناظم ترجمان القرآن

مجموعہ تفاسیر فراہی

تالیف : مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہی اس دور آخر میں تفسیر کے امام گذرے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں اور اس کی وہ مشکلیں حل کیں جو اب تک تفسیر کی کتابوں میں حل نہیں ہو سکی تھیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل تفسیر عربی میں ہے۔ اس کے جو اجزاء شائع ہو چکے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص

مولانا امین احسن اصلاحی

نے ان کا شستہ اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور شروع میں مصنف کے مختصر حالات زندگی بھی دے دئے ہیں اور مولانا حمید الدین فراہی کے مقدمہ تفسیر کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جو اصول تفسیر پر مولانا کے قلم سے ایک نہایت جامع رسالہ ہے۔ اس مجموعہ میں مقدمہ تفسیر کے علاوہ مندرجہ ذیل سورتوں کی تفسیروں کے ترجمے شامل ہیں:۔

تفسیر آیۃ بسم اللہ ' تفسیر سورۃ فاتحہ ' سورۃ ذاریات' سورۃ قیامہ ' سورۃ تحریم' سورۃ عبس' سورۃ و الشمس' سورۃ و التین' سورۃ و العصر' سورۃ فیل' سورۃ کوثر' سورۃ کافرون' سورۃ لہب' سورۃ اخلاص ۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے ہر تفسیر میں قرآن مجید کی ایسی اہم مشکلیں حل کی ہیں جو قرآن کے دوسرے مشکل مقامات کے حل کے لئے کلید کا کام دیتی ہیں اور یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ایک شخص مولانا کے مقدمہ تفسیر قرآن کی روشنی میں ان تمام اجزاء کا بغور مطالعہ کرے تو وہ مولانا فراہی کے اسلوب فکر سے اچھی طرح آشنا ہو جائیگا اور قرآن پر محققانہ تدبر کے لئے اپنی راہیں خود کھول لیگا۔

تفسیری حقائق و معارف کا یہ مجموعہ ۵۲ے صفحات ۲۰×۲۶ / ۸ سائز پر مشتمل ہے اور اس کے متعلق بلا تکلف یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ اسکا ہر صفحہ تفسیری حقائق کا بیش بہا گنجینہ ہے - کتابت و طباعت نہایت نفیس - جلد عمدہ کپڑے کی .... قیمت : چودہ روپے

تعلیمات

تعلیم کے موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اب تک جو کچھ فرمایا یا لکھا ہے نیز جماعت اسلامی نے تعلیم کے موجودہ تصور اور رائج الوقت طریق تعلیم اور نصاب میں جس انقلابی تبدیلی کی اسکیم پیش کی ہے اس سارے مواد کو اس مجموعے میں یکجا کر دیا گیا ہے - دیدہ زیب گرد پوش کے ۲۰×۳۰ / ۱۶ سائز سفید کاغذ ۲۸۸ صفحات قیمت صرف تین روپے - فوراً اپنی فرمائش سے مطلع فرمائیں۔

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں چھپا